کوائف و صحائف

۱۸۵۷ء

کوائف وصحائف

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

مئی ۱۹۵۷ء

قیمت دو روپے

مطبوعہ فیروز سنز ، کراچی

مندرجات

دیباچہ

۱۸۵۷ع ھماری زندگی کی ایک اھم تاریخ ھے جو گزشتہ سو برس ھمارے ذھنوں میں برابر تازہ رھی اور آئندہ بھی بھولی نہ جا سکیگی ۔ اس برصغیر کی پہلی عوامی جدوجہد ، جس کا نام بیرونی حکومت کی مصلحت کے بموجب صرف ''غدر،، قرار پایا، اس سرزمین پر اپنی آزادی کو محفوظ کرنیکی آخری کوشش تھی جو ھم نے کی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی سب سے بڑھکر ھماری ھی تباھی کا موجب ھوئی اور ھم ھی مخصوصاً بیرونی حکومت کی داروگیر کا نشانہ بنے ۔ یہ ھمارے عہد حکمرانی کا آخری باب تھا جو ھمارے خون سے لکھا گیا ۔ ایک طرف یہ ایک سیاسی انقلاب تھا جس نے اس دور ملوکیت کو گویا اپنے طبعی انجام تک پہنچایا جس میں شہاب الدین غوری بلکہ محمد بن قاسم کی آمد سے لیکر مغلوں کے دودمان عالی شان تک بہت سے غلامان محمد، صاحب تاج و سریر اور اس برصغیر کے ھردلعزیز حکمران رھے ۔ دوسری طرف ھر سیاسی انقلاب کی طرح اس نے ھماری تہذیبی تاریخ کا بھی ایک نیا ورق الٹا ۔ وہ معاشرہ جس میں پچھلی صدی کے وسط تک یہ تہذیب پھلتی پھولتی رھی منتشر ھوگیا، اور نئی شیرازہ بندی میں بعض جدید عناصر بھی لازماً داخل ھوئے جیسا کہ زمانے کا مقتضا تھا ۔

یوں تو ۱۸۵۷ع کے واقعات ہماری ناکامی کا افسانہ ہیں لیکن زندہ قوموں کی تاریخ میں ایسے سانحات اکثر آتے ہیں۔ دیکھنے کے قابل یہی بات ہوتی ہے کہ انہوں نے ان سے کیا سبق لیا۔ اکثر مستقبل کی کامرانیوں کے سرے بھی وہیں سے شروع ہوتے ہیں جہاں ماضی کی ناکامی کا سلسلہ تمام ہوتا ہے۔ وہ قومیں جو قوت حیات سے بہرہ مند ہوں تاریخ کے چیلنج کو کبھی یوں بھی قبول کرتی ہیں کہ ۱۸۵۷ع کی قربانیاں ۱۹۴۷ع میں رنگ لاتی ہیں۔

ہمارے لئے وہ تاریخ اور وہ دور بہرحال بہت اہم ہے جبکہ ہماری ملی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب رونما ہورہا تھا۔ یہ کتاب چند نشری تقریروں سے ترتیب دی گئی ہے جو ریڈیو پاکستان لاہور سے کی گئیں اور جن میں فاضل مقررین نے اس عہد کی ذہنی و سماجی زندگی کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اور اس سلسلے میں بعض ایسی دستاویزات پر بھی نظر ڈالی ہے جن میں جنگ آزادی کا افسانہ مذکور ہے۔ ان صحائف میں اردو صحافت کے اولیں نمونے بھی شامل ہیں اور اردو نثر کے بعض نوادرات بھی، خصوصاً غالب کے مکاتیب، جنکی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

ہم اس مفید و دلچسپ مجموعے کو بڑے فخر سے پیش کررہے ہیں اور جناب سید ذوالفقار علی بخاری، ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان، کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ مضامین ہمیں اشاعت کے لئے عنایت فرمائے۔

*

مذہبی رجحانات

(غلام رسول مہر)

جنگ آزادی جسے غیر ملکیوں کے دور اقتدار میں ''غدر،، کے نام سے شہرت دی گئی بجائے خود ہمارے بر عظیم کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ نہ تھی لیکن نتائج و عواقب کے اعتبار سے اس جنگ کو ہماری تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ اجنبی اقتدار کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کی ایک نہایت پر خلوص کوشش تھی۔ اگرچہ بعض اتفاقی حوادث و سوانح کی بنا پر، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اس لئے بھی کہ اس جنگ کے نتیجے میں ہمارے تمدن، ہماری سیاست، ہماری ثقافت، ہمارے مذہبی رجحانات اخلاق و عادات اور زندگی کے تمام دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑا۔ میں اپنی بات چیت صرف مذہبی رجحانات تک محدود رکھونگا۔

غیر ملکی اقتدار کی توسیع کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے لئے جو خطرے پیدا ہوئے ان میں سے تین خطرے جنگ آزادی کے بعد نہایت خوفناک شکل میں سامنے آچکے تھے۔ ایک طرف مسیحی مشنری تھے جن کے حملے سب سے بڑھکر اسلام پر ہورہے تھے۔ اولاً اس لئے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں پر سخت ضرب لگ چکی تھی۔ ان کا برائے نام اقتدار بھی ختم ہوچکا تھا اور وہ انگریز حاکموں کے نزدیک معتوب ہونے کے باعث سخت پریشان

حال تھے ۔ اس حالت میں ان کے مذہب کو ھدف بنالینا مشنریوں کو سہل بھی نظر آیا اور نتیجہ خیز بھی ۔ ثانیاً بعض مشنری سمجھتے تھے کہ اگر وہ، معاذ اللہ، اسلام کو شکست دینے میں کامیاب ھوجائیں گے تو پھر کوئی دوسرا مذھب ان کے مقابلے پر ٹھہر نہ سکیگا ۔ تیسرے انگریزوں نے مسلمانوں کے ھاتھ سے اقتدار چھینا تھا، انہیں یقین تھا کہ مسلمان ھی انکے خلاف اٹھنے کی ھمت رکھتے ھیں ۔ لہذا مسلمانوں کی سیاسی شکست کو مکمل و فیصلہ کن بنانے کے خیال سے ان کے مذھب پر اعتراضات کا سیل بہا دیا گیا۔ مشنریوں کی ان کوششوں کے خلاف متعدد مذھبی عالموں نے مردانگی سے جہاد کا سرو سامان کیا جن میں مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور بانی مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) اور ڈاکٹر وزیر خاں مرحوم کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ھیں ۔ سرسید مرحوم و مغفور نے اس سیل کی روک تھام اور اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لئے جو مجاھدانہ کارنامے انجام دئے ان کا سرسری ذکر میں آگے چل کر کرونگا ۔

دوسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا ۔ طبعاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نہایت سخت ملال تھا اور انگریز چونکہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں ھی سے خائف تھے اس لئے نظم و نسق ملک میں ان پر اعتماد کے لئے تیار نہ تھے ۔ جنگ آزادی میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا اسلئے انگریزوں کو یقین ھوچکا تھا کہ مسلمان کبھی ان سے تعاون نہ کریں گے ۔ یوں ایسی صورت پیدا ھوگئی تھی کہ انگریزوں کے دور اقتدار میں مسلمان نظم و نسق میں حصہ داری سے محروم ھوکر اس پستی میں گرجاتے جس میں ھزاروں سال سے اچھوت گرے ھوئے تھے ۔ تیسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کی بنیادیں مضبوط ھونے کے بعد انگریزی تعلیم جاری ھوگئی تھی اور روز بروز اسکا دائرہ پھیل رھا تھا ۔ مسلمان چاھتے بھی تو اس تعلیم سے بالکل بے تعلق نہ رہ سکتے تھے۔ اگر وہ انگریزی تعلیم

پاتے تو اندیشہ تھا کہ ان کے مذہبی معتقدات پر بہت برا اثر پڑے گا - حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی - دور زوال میں مذہبی معتقدات بھی بڑی حد تک بگڑ چکے تھے - صحیح دینی تعلیم کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تھا - ان حالات کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مشنریوں کے لئے مسلمانوں میں اشاعت مسیحیت کا راستہ صاف ہو جاتا -

سرسید مرحوم وہ بزرگ تھے جنہیں تینوں خطروں کا پورا احساس ہوا اور سنہ ۵۷ع سے زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد یہی تھا کہ ان تینوں خطروں کا انسداد ہو یعنی :

مشنریوں کے اعتراضات کے محض الزامی جوابات پر قناعت نہ کرلی جائے بلکہ تحقیقی اور علمی جوابات دئے جائیں اور اس سلسلے میں اسلام کی برتری محکم حقائق کی بنا پر ثابت کی جائے - انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان بے اعتمادی اور بد ظنی کی جو خلیج حائل ہوچکی تھی اسے پاٹا جائے تا کہ مسلمان اس سر زمین میں ایک معزز قوم کی حیثیت میں ملکی نظم و نسق کے حصہ دار بن سکیں - ان کے لئے انگریزی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی اسلامیت نہ صرف محکم و پائیدار بن جائے بلکہ ان میں اسلام کی حقانیت و افضلیت کا سچا جذبہ اور جوش پیدا ہوجائے ، ان کو صرف رسمی اور موروثی حیثیت ھی میں مسلمان نہ سمجھا جائے بلکہ وہ حقیقی معنوں میں پر جوش مسلمان بن جائیں -

مسلمان اگر انگریزی تعلیم سرکاری درسگاھوں یا مشن سکولوں اور کالجوں میں پاتے تو سخت خطرہ تھا کہ ان کے اسلامی عقائد پر اچھا اثر نہ پڑے گا - لہذا سرسید نے اپنے زیر اہتمام ایک معیاری درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ فرمایا - جہاں مسلمانوں کو بہتر مسلمان بنانے کا پختہ انتظام موجود ہو - اس ارادے نے علی گڑھ کالج کی شکل اختیار کی اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ سرسید کی یہ سکیم بہ اعتبار نتائج بہت کامیاب ہوئی اور

علی گڑھ کے نمونے پر مسلمانوں نے جا بجا جتنی درسگاہیں قائم کیں انکی خدمات جلیلہ روز روشن کی طرح سب پر آشکارا ہیں -

اسی سلسلے میں سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی - اسکا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پائیں انکے سامنے مذہب کو نئی عقلیت کے نقطہ نگاہ سے معقول طریق پر پیش کیا جائے - پیش نظر موضوع اس امر کا متحمل نہیں کہ سرسید مرحوم کی تفسیر پر مخالف و موافق بحثوں کا جائزہ لیا جائے - صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ سرسید نے اس سلسلے میں جو قدم اٹھایا وہ ان کے اختیار کردہ مسلک کا ایک لازمی حصہ تھا - جن اصحاب کو بعض مسائل و امور میں ان سے اختلاف رہا وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ سرسید نے ایک نہایت ضروری اور اہم کام انجام دیا اور اس کے فوائد مضرتوں سے یقیناً زیادہ تھے -

علی گڑھ کالج کے خواب کو جامہ عمل پہنانے سے پیشتر سرسید نے بائبل کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی - خواجہ حالی کے بیان کے مطابق وہ عہد عتیق میں سے کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک پہنچے تھے اور اسلوب یہ اختیار کیا تھا کہ بائبل کے جو بیانات قرآن مجید کے مطابق تھے ان کی توضیح کرتے - جہاں اختلاف نظر آتا اسکی وجہ بیان فرماتے ، اور اسلام کی محکمیت ثابت کرتے - اس کوشش کا مقصد بھی یہی تھا کہ اختلافات کے بجائے موافقات سامنے آئیں اور انہیں پر توجہ مرتکز ہو - اجنبیت کی خلیج کو پاٹنے کی یہ بھی ایک شکل تھی - اس سے ہمارے الہامی مذاہب کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پڑی - یہ سلسلہ دینی مقاصد کی پیش برد کے لئے بے حد مفید تھا -

علماء کرام کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہر قسم کی سیاسی مشکلات کے باوجود انگریزوں سے تعاون کا روا دار نہ ہوا - انہوں نے جابجا خالص دینی درسگاہیں قائم کیں تاکہ مسلمانوں میں دینی حمیت کو زندہ رکھیں اور ان کے لئے ان سے استفادے

کے مواقع بہم پہنچائیں جو دین کے حقیقی سرچشمے تھے اور زوال کے بعد ان کے بہرہ مندی کے مواقع بڑی حد تک ختم ہوچکے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سی درسگاہوں کے نام لئے جاسکتے ہیں جو اس بر عظیم کے طول و عرض میں جابجا قائم ہوئیں اور اب تک موجود ہیں ۔ اس سلسلے کی جس درسگاہ نے سب سے بڑھکر شہرت پائی وہ دیوبند کی درسگاہ تھی ۔ اسکی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی رح نے رکھی ۔ یہ بالکل معمولی سرو سامان کے ساتھ شروع ہوئی تھی ۔ لیکن بانیوں کے اخلاص اور حب اسلام کی بدولت اس بر عظیم کی نہایت اہم دینی درسگاہ بن گئی ۔ حضرت مولا نامحمد قاسم، دین اسلام پر مخالفوں کی نکتہ چینیوں کے جوابات دیتے رہے ۔ خواہ وہ نکتہ چینیاں مشنریوں کی طرف سے ہوں یا دوسرے مذاھب کے پیروؤں کی طرف سے ۔ اس سلسلے میں ان کے خطبات اور تقریریں ادب اسلامیہ کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں ۔

علیگڑھ اور دیوبند بظاھر دو مختلف قسم کی درسگاہیں تھیں لیکن ان دونوں نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی، علمی و سیاسی اور اخلاقی و ثقافتی میراث کو بہتر سے بہتر طریق پر محفوظ رکھنے کی جو کوششیں کیں انکی مشکوریت سے کسے انکار ہوسکتا ہے ۔ جو مسلمان ۱۸۵۷ع میں بہ ظاھر اپنا سب کچھ کھوچکے تھے وہ تھوڑی ھی مدت میں سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے ۔ پھر انتہائی سرگرمی سے آگے بڑھے اور از سر نو ایک زندہ ، غیور اور مجاھد قوم بن گئے ۔ جزوی یا بعض معاملات میں ناکامیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جن سے کسی قوم کو بھی زندگی کے مختلف مراحل میں مفر نہیں ، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جن مسلمانوں کے متعلق ۵۷ع کی جنگ آزادی کے بعد سمجھا جاچکا تھا کہ وہ اب ھمیشہ کے لئے ختم ہوچکے ہیں ، وہ نہ صرف اٹھے بلکہ اس وسیع سر زمین کی تقدیر میں نہایت اہم وظیفہ بجا لانے کے قابل بن گئے ۔ حالانکہ انہیں کسی دائرے

میں وہ وسائل مہیا نہ رہے تھے جو اس ملک میں ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انکی قومی میراث بنے رہے۔

ان دینی اور قومی مجاہدوں کی فہرست بہت طویل ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ع کا خونیں دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ نتائج سے متالم ضرور ہوئے ہوں گے لیکن نہ اسلام پر ان کے ایمان کی پختگی میں فرق آیا نہ انکے قدم ہمت میں لغزش پیدا ہوئی۔ نہ ان کی غیرت و حمیت کی حرارت میں افسردگی آئی۔ نہ وسائل کا فقدان ان کا عناں گیر ہوسکا۔ وہ اپنے فرض کو پہچانتے ہوئے اٹھے اور انہوں نے عمل کے جو راستے ہموار کردیئے تھے ان پر چلنے کے لئے پوری قوم میں بے پناہ جوش پیدا کردیا۔ انہیں بزرگوں کے پر خلوص کارناموں کی برکت تھی کہ مسلمانوں نے حقیقی مذہبی میراث کے تحفظ کو اپنا نصب العین بنایا۔ باقی رہا یہ امر کہ ہم اس میراث کی عظمت و جلالت کو بحال رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں یا کامیاب ہوں گے تو اس بارے میں فیصلے کا قلم حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔

تعلیم

(ڈاکٹر محمد باقر)

جنگ آزادی کا اثر تعلیم پر کیا ہوا، اس کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ سن ستاون کے انقلاب سے پہلے ہمارا نظام تعلیم کیا تھا۔ اس سلسلے میں اب تک جو تحقیق ہوچکی ہے وہ اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ جنگ آزادی سے پہلے اور جنگ آزادی کے بعد تک مدارس اور درسگاہوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ پنجاب سے لیکر بنگال تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ع میں مصر سے ایک کتاب ''صبح الاعشی،، کے عنوان سے بارہ جلدوں میں شائع ہوئی تھی جو مختصر پیمانے پر اپنے عہد کا انسائیکلوپیڈیا تھا۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب ہندوستان میں خاندان تغلق حکمران تھا۔ اس میں درج ہے کہ صرف ہند کے پایۂ تخت دلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔ اس زمانے میں تعلیم کے لئے عموماً علیحدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا۔ اور تمام مسجدیں مدارس کا کام دیتی تھیں اسلئے ہر قدیم مسجد ایک بڑی درسگاہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم قدم پر ہم کو وسیع اور شاندار مسجدیں ملتی ہیں۔ دلی، آگرہ، لاھور، جونپور، احمد آباد، گجرات وغیرہ قدیم اسلامی دارالسلطنت میں جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں اور جو اب تک

باقی ہیں ان کی ہیئت کذائی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ تعلیم گاہوں کے کام آتا تھا۔ ان مسجدوں میں اب تک صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجروں کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے جو درحقیقت طلبا اور معلمین کے رہنے کے مقامات تھے۔ قدیم خانقاہیں بھی تعلیم گاہوں کے مصرف میں آتی تھیں۔ سلاطین اور بزرگان کرام کی قبروں پر جو مقبرے اور روضے تعمیر ہوتے تھے ان کے ساتھ ارد گرد بہت سے حجرے اور کمرے اسی غرض سے تعمیر ہوتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام آئیں۔

اجمالی طور پر یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان درسگاہوں میں نصاب تعلیم کیا تھا۔ میں صرف وہی نصاب عرض کرونگا جو جنگ آزادی سے معاً قبل رائج تھا کیونکہ اس سے پہلے نصاب تبدیل بھی ہوتا رہا ہے۔ اسلامی درسگاہوں کے نصاب میں جو فنون اور کتابیں شامل تھیں انکی تفصیل یہ ہے:

صرف و نحو، بلاغت، ادب، فقہ، اصول فقہ، منطق حکمت، کلام ریاضی، فرائض، مناظرہ، تفسیر اصول حدیث، حدیث۔ اس نصاب کو کرنے کے لئے جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اسکا ذکر کروں تو بات لمبی ہوجاتی ہے۔ بہر صورت مختصر طور پر یہ نظام تعلیم جنگ آزادی سے پہلے رائج اور مقبول تھا۔

سن ستاون کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سر زمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال و انحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور ان کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و علم نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی، لیکن ارباب فکر کے دو طبقے ہوگئے ایک طبقہ جو علماء کرام کا تھا، اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصاب درس کی تعلیم پر مرکوز کردی۔ اسی مقصد کے لئے عربی مدارس قائم کئے گئے اور ان کے ذریعے دینیات یعنی تفسیر حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق علوم و فنون

کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم و فنون سیکھیں۔ بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش خان بہادر نواب عبداللطیف نے کی جنھوں نے سن ۱۸۶۳ء میں (Mohammadan Literary Society) کے نام سے کلکتہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھی جس میں شہر کے متوسط اور امیر طبقہ کے لوگ جمع ہوکر مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر غور کرتے اور انگریزی کی تعلیم و تبلیغ کا احساس اپنے اراکین کو دلاتے۔ چنانچہ اس انجمن کی مساعی **اس** حد تک کامیاب ہوئیں کہ جلد ھی کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ میں انگریزی نصاب میں داخل ہوگئی۔ اس انجمن کی شہرت اور مقبولیت سے ملک کے دوسرے شہروں میں بھی انگریزی کی تعلیم کے رواج کا پرچار ہوا اور وہاں بھی اس قسم کی انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ اب سوال یہ تھا کہ کس قسم کی تعلیم کو رواج دیا جائے اور لوگوں کو تعلیم دینے کےلئے کس قسم کے ادارے قائم کئے جائیں۔ مسلمان جب اس تذبذب کے عالم میں تھا تو انگریز اپنا تسلط جمانے اور اقتدار مستقل کرنے کی فکر میں تھا۔ اس لئے اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قدیم مدارس اور تعلیم گاھوں سے قطعی لا تعلقی کا اظہار کیا۔ ان درسگاھوں کے معلموں کو پہلے بادشاہ سے لیکر مقامی حکمرانوں تک سے وظائف اور مشاھرے ملتے تھے لیکن جب حکمران ھی بدل گئے تو ان کی خدمات کا معاوضہ کون دیتا۔ نتیجہ یہ کہ پرانی قسم کی درسگاھیں از خود اپنے دروازے بند کرنے لگیں اور ان کے طالبعلم یا تو جہالت اور گنوار پن کی نذر ہوگئے یا نئے قسم کے سکولوں میں جانے لگے جن کی تعداد بہت کم تھی۔ سن ۱۸۵۹ء میں حکومت ھند نے جو اطلاع حکومت انگلستان کو ھندوستانی تعلیم کے متعلق بھیجی ھے اس میں لکھا ھے:

''غربا سکولوں میں جانا پسند ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ اتنے مفلس ہیں کہ سکول کی فیس ادا نہیں کرسکتے اور ان کے والدین انکی مزدوری سے ان کے لئے نان و نفقہ بہم پہنچاتے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ اور امرا صرف انگریزی طرز کے سکولوں کے لئے کچھ قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں،، نتیجہ یہ کہ انگریزوں نے سرکاری طور پر اور عیسائی مبلغین کے زیر اہتمام ہندوستان میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کھلوائے، لیکن قدیم درسگاہوں کے مقابلے میں ان کی تعداد کیا تھی، اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ۱۸۸۲ ع میں سارے بنگال میں صرف ۱۰۶ ہائی سکول تھے جو حکومت انگلشیہ کی زیر نگرانی کھلوائے گئے تھے۔ حکومت ہند نے ۱۸۵۷ع میں یونیورسٹی ایکٹ بھی پاس کیا اور ہندوستان میں یونیورسٹیاں بھی کھلنے لگیں۔ سب سے پہلی یونیورسٹی ۲۴۔ جنوری ۱۸۵۷ع کو کلکتے میں قائم ہوئی اور اسی سال ۱۸۔ جولائی کو بمبئی یونیورسٹی کھلی۔ لیکن یہ سارا ڈھانچہ اس قسم کا تھا جس میں انگریزی تو مقبول ہوئی اور انگریزی تعلیم سے لوگ فیضیاب ہوئے لیکن لکھنے پڑھنے والے لوگ دن بدن کم ہوتے گئے۔ اور ان پڑھ عوام کی تعداد بڑھتی گئی۔

۱۹۳۱ع میں حکومت ہند نے جو تعلیمی رپورٹ شائع کی تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں صرف ۱۶ فیصدی مرد اور ۳ فیصدی عورتیں پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت تک ہندوستان کی بیشتر نئی درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوگیا تھا، جو غیر ملکی زبان تھی اور جسے سیکھنے کے لئے طلبا کا کافی وقت صرف ہوجاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ درسگاہوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔ جنگ آزادی سے پہلے اجمیر، دہلی، پنجاب، نارنول، آگرہ فتح پور سیکری، متھرا، نروار، بدایوں، دارا نگر، رامپور روہیلکھنڈ، اودھ، الہ آباد، فرخ آباد، جونپور، غازی پور، بہار، بنگال، دکن

مالوہ، اچھ، ملتان، کشمیر، گجرات، سورت، اور لاھور میں ، جہاں ھمیں ہزاروں درسگاھوں کے نشان ملتے تھے، وھاں اب ھر صوبے میں اور وہ بھی صرف بڑے بڑے شہروں میں چند درجن مدرسوں کی تعداد ملتی ھے -

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے - قدیم و جدید درسگاھیں ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں - لیکن افسوس ناک امر یہ تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک زنی پیدا ھوگئی - جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب سے بیزار تھا - ۱۹۲۰ع میں تحریک خلافت کا زور ھوا تو اس نے سب کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر کھڑا کردیا اور اس میل جول کا نتیجہ یہ ھوا کہ دونوں گروھوں نے ایک دوسرے کے معائب و محاسن کو قریب سے دیکھا اور نیک نیتی سے اپنے اپنے لائحہ عمل کی اصلاح چاھی - انہیں اس مقصد میں کامیابی ھوئی یا نہیں لیکن ایک بات ضرور ھے کہ اس میل ملاپ سے چند اور نئی قسم کی درسگاھیں معرض ظہور میں آگئیں - مثلاً مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے اصلاح کا جو نعرہ بلند ھوا اس کی بدولت جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جنم لیا، اور نصاب عربی اور قدیم علوم میں اصلاح کا جو مطالبہ پیدا ھوا اسکے اثرات ندوۃالعلما میں ظاھر ھوئے - گو اب بھی ان عارضی اور قلیل اصلاحات کا جائزہ لیا جائے تو ایک بات بار بار سامنے آتی ھے کہ ملک میں جنگ آزادی کے بعد ناخواندگی روز بروز بڑھتی ھی گئی اور پڑھے لکھے لوگ کم ھوتے ھی گئے، گو کالج اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کی تعداد روز افزوں تھی -

۱۹۳۸ع میں جواھر لعل نہرو انگلستان گئے تو ان کی ایک تقریر کے موقعہ پر ھال کو انگریزی راج کی برکات کے اعداد و شمار سے سجایا گیا تھا اور کپڑے کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر سرکاری کتابوں کے حوالے سے یہ لکھ کر لٹکایا گیا تھا کہ جنگ آزادی کے بعد ھندوستان میں مختلف قسم کے امراض سے کتنی

اموات سالانہ ہوتی ہیں، اجناس کے نرخ کس قدر بڑھ گئے ہیں، دستکاروں اور علوم کے ماہرین کی تعداد کس قدر کم ہوگئی ہے اور اس موقعہ پر ایک اشتہار میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ جنگ آزادی کے بعد درسگاہوں کی تعداد کس قدر کم ہوگئی ہے اور ناخواندگان کی تعداد کس قدر بڑھ گئی ہے۔ جب یہ اعداد و شمار انگریز حاضرین نے دیکھے تو حیرت سے منہ میں انگلیاں چبانے لگے۔ ہمارے کئی انگریز دوستوں نے ہم سے پوچھا کیا یہ حقیقت ہے؟ لیکن ہمارے پاس اس کا جواب اثبات کے سوا کیا تھا۔ کیونکہ انگریز کے ترتیب دئے ہوئے اعداد و شمار خود ہی بول رہے تھے کہ انگریزی نظام تعلیم نے ملکی نظام تعلیم کا قلع قمع کرکے اس کا کوئی مناسب بدل پیش ہی نہیں کیا تھا۔ جس سے خواندگان کی تعداد بڑھ سکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ مدارس اور کالجوں کا یہ غوغائے روا رو حکیم الامت کی زبان میں ابھی تک توجہ کا از حد محتاج ہے۔

سیاسیات

(ازشکور احسن)

۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام رہی تو ہندوستانیوں پر ہولناک مظالم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مسلمان خاص طور سے اس مشق ستم کا نشانہ بنے۔ اس لئے کہ انگریز نے حکومت ان سے چھینی تھی اور اسے ان سے انتہا پسندی کا شکوہ تھا۔ جنگ آزادی سے چودہ برس پہلے ہندوستان کے گورنر جنرل نے کہہ دیا تھا کہ مسلمان بنیادی طور پر ہمارے مخالف ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ۵۷ء کی ناکام جد و جہد کے بعد انگریز نے اس مخالفت کا جی بھر کر بدلہ لیا۔ ان کے رہنماؤں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ان میں شہزادوں سے لیکر عالموں اور شاعروں تک سبھی شامل تھے۔ سرولیم میور نے اپنی کتاب (بغاوت ہند) میں بعض خفیہ دستاویزوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۸ نومبر ۵۷ء کی صبح کو چوبیس شہزادوں کو دھلی میں تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ جن میں بادشاہ کے داماد، برادران نسبتی، بھانجے اور بھتیجے شامل تھے۔ جھجھر بلب گڑھ فرخ نگر اور فرخ آباد کے رؤسا نے جنگ آزادی میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض کو سولی پر لٹکادیا گیا۔ اور بعض کو عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ مسلمان بستیوں کو اجاڑنے کی منظم کوشش کی گئی، ان میں ایک یہ

بھی تھی کہ فتح پور پر، جس نے بغاوت میں حصہ لیا تھا، حملہ کیا جائے۔ پٹھانوں کے محلے تباہ و برباد کردئے جائیں، اور ان کے تمام مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ دھلی میں جنگ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو ایک عرصہ تک دوبارہ بسنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مرزا غالب کے بعض خطوط سے مسلمانوں کی بے چارگی کا پتہ چلتا ھے۔ ایک خط میں یوں لکھتے ھیں: ''دلی کہاں، ھاں کوئی شہر قلمرو ھند میں اس نام کا تھا۔ اھل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ھیں میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بلی ماراں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ مردود، مطرود، محروم''۔

حقیقت یہ ھے کہ اگرچہ ۵۷ء کی جنگ آزادی میں سب فرقے اور قومیں دل و جان سے شریک ھوئیں لیکن جیسا کہ اشوک مہتہ نے اپنی کتاب ('عظیم الشان بغاوت') میں لکھا ھے مسلمان تاریخی اور نصب العینی تقاضوں کے تحت انگریز دشمنی میں ھندؤوں سے بے انتہا آگے تھے، ان میں سے اکثر پر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور سید احمد شہید کے مجاھدانہ کارناموں کا بڑا گہرا اثر تھا اور وہ ھندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے پاک کرکے ایک آزاد حکومت کا قیام چاھتے تھے۔ چنانچہ جنگ آزادی میں عالموں کی جماعت پیش پیش رھی۔ جنگ میں نہ صرف مسلمانوں کو زیادہ قربانی دینی پڑی۔ بلکہ انہوں نے جنگ کے بعد بھی شکست کا اعتراف کرنے سے انکار کیا۔ اور ایک عرصہ تک اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ ۱۸۶۳ء میں انگریزوں کو سید احمد شہید کے معتقدوں سے آزاد سرحد پر ایک خوفناک جنگ لڑنی پڑی۔ اور انگریز کے خلاف قبائلی علاقہ سے لیکر پٹنہ تک بغاوت کی ایک منظم تحریک جاری رھی جسے بعد میں نہایت بے رحمی سے کچلا گیا۔ اور اس تحریک کے علمبرداروں میں سے جن میں مولانا یحییٰ علی اور مولوی محمد جعفر کا نام خاص طور سے قابل ذکر ھے، بعض کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

وحشت اور درندگی کا جو دور ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا وہ مسلسل دس بارہ برس تک جاری رہا۔ جس نے بالآخر مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کردیا۔ اور پوری قوم پر مایوسی اور افسردگی کا احساس غالب آگیا۔ البتہ انگریز سے دشمنی اور نفرت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے انگریزی پڑھنے سے بھی انکار کردیا۔ عین اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سرسید احمد خاں نے اپنے ہاتھ میں لی۔ سرسید کا عقیدہ یہ تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں نئی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان تعلیم میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اقتصادی طور پر ان کی یہ حالت تھی کہ ان کی زمینداریاں ضبط ہوچکی تھیں اور وہ سرکاری ملازمتوں سے محروم تھے۔ تجارت کے میدان میں پہلے ہی ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ چنانچہ سرسید کے خیال میں قوم کو ورطۂ مذلت سے نکالنے کا علاج صرف تعلیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے اپنی تمام کوششیں علیگڑھ کالج بنانے اور معاشرت کی اصلاح کرنے کے لئے وقف کردیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سیاسی تقاضوں سے بے خبر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علیگڑھ کی پوری تحریک کا پس منظر سیاسی تھا۔ تعلیم ان کی نظر میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ایک وسیلہ تھا اور وہ یہ کہتے تھے کہ مسلمان اسی وقت سیاسی اقتدار حاصل کرسکتے ہیں کہ پہلے ان میں تعلیم کا چرچا ہو اور ان میں قومیت کا احساس اور بلند نظری پیدا ہوجائے۔ سرسید ملکی مسائل میں اتحاد عمل کے حامی تھے اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جب وہ ۱۸۸۴ء میں لاہور آئے تو برھمو سماج اور آریہ سماج کے ایک متفقہ وفد نے ان کی خدمات کو سراہا۔ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر ان کی متعدد تقریریں موجود ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں انہیں سب سے پہلے مایوسی اردو ہندی کے جھگڑے پر ہوئی۔ اس سلسلہ میں خود ان کے یہ الفاظ زبردست پیشینگوئی کی حیثیت رکھتے ہیں: ''اب مجھکو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں

کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکینگی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا،،۔

دونوں قوموں میں نفاق کی جو صورت پیدا ہوگئی تھی اس کا بیج بونے میں برطانوی حکومت نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ مثال کے طور پر جنگ آزادی کے فوراً بعد مراد آباد کے کمان دار لفٹیننٹ کرنل جوہن کرک نے اپنے ایک مراسلہ میں ایک جگہ لکھا کہ حکومت ہند کو لڑانے اور حکومت کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا چاہئے۔ ۱۴ - مئی ۱۸۵۹ع کو بمبئی کے گورنر لارڈ ایلفنسٹن نے ایک تحریر میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا: ''لڑا کر حکومت کرنا رومنوں کا شیوہ تھا، اور یہی شیوہ ہمارا بھی ہونا چاہئے،،۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہندوستانیوں میں اتحاد عمل اور اتحاد مقاصد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ۱۸۸۵ع میں جب لارڈ ڈفرن ہندوستان کے وائسرائے ہوئے تو انہوں نے انڈین سول سروس کے ایک ریٹائرڈ افسر مسٹر ہیوم کو اس بات کی دعوت دی کہ ایک ایسی انجمن منظم کرے جو حکومت سے تعاون کرسکے اور اسے صلاح مشورہ دے سکے۔ اس انجمن کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ اس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ۱۸۸۵ع میں ہوا۔ اپنے ابتدائی مرحلوں میں حکومت برطانیہ سے وفاداری کانگریس کا شعار تھا۔ اور یکے بعد دیگرے اس کے مختلف لیڈر مثلاً دادا بھائی ناروجی۔ بدر الدین طیب جی اور فیروز شاہ، اپنے صدارتی خطبوں میں حکومت برطانیہ سے وفاداری اور نیازمندی کا دم بھرتے رہے۔ سرسید نے شدت سے یہ محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی عدم موجودگی میں کانگریس کبھی کوئی زبردست کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ دوسری طرف اگرچہ سرسید جمہوری نظام کو پسند کرتے تھے۔ لیکن وہ اس مغربی پارلیمانی نظام

کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مہلک سمجھتے تھے۔ جس میں ہر فیصلہ اکثریت کے رحم و کرم کا محتاج ہو۔ یہی وجہ ھے کہ انہوں نے کانگریس کی مخالفت کی چنانچہ ۱۸۸۷ع میں اپنی ایک تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ اگر کونسل کے ممبر انتخابات سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ھوسکتی۔ کیونکہ ہندوؤں کی تعداد بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ھے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا، اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا، تو چار ہندو ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے اور تعلیمی اور قومی اصلاح پر اپنی تمام قوتیں مرکوز کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی زمانے میں کانگریس کے بعض لیڈروں میں جن میں تلک کا نام خاص طور سے قابل ذکر ھے، کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا، جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے تھے۔ ادھر ۱۸۹۳ع کے قانون کے مطابق انتخابات کا نیا طریقہ رائج ہوا۔ گو مسلمانوں کو خاطر خواہ نمائندگی نہ مل سکی کیونکہ ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی حیثیت بہت معمولی تھی ملازمتوں میں ان کا حصہ پہلے ھی بہت کم تھا۔ چنانچہ جب ہندوستان کے لئے نئی اصلاحات کا اعلان کیا گیا تو مسلمانوں کا ایک وفد سرسید کے مشہور معتمد دوست اور نائب نواب محسن الملک کی قیادت میں اکتوبر ۱۹۰۶ع میں لارڈ منٹو سے ملا اور جداگانہ طریق انتخابات کا مطالبہ کیا۔ جو منظور کرلیا گیا۔ اسی سال ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تاکہ مسلمان اپنے سیاسی حقوق اور مفاد کا تحفظ کرسکیں۔ چند برس تو مسلم لیگ کی پالیسی وھی رہی جس پر کانگریس شروع شروع میں گامزن ہوئی تھی، لیکن جب حکومت ہند نے تقسیم بنگال کے فیصلہ کو منسوخ کیا تو مسلمانوں میں حکومت سے بے اطمینانی اور عدم اعتماد کی لہر دوڑ گئی اور مولانا محمد علی نے جو آگے چل کر تحریک خلافت کے

رھنما بنے کھلے لفظوں میں حکومت کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی۔
اس کے بعد ھندوستان کے مسلمانوں میں ایک نئے دور کا آغاز ھوا یہ بڑا ھنگامہ خیز دور تھا برطانوی اقتدار کا طلسم ٹوٹ رھا تھا۔ علیگڑھ میں برطانیہ سے بغاوت کے آثار پیدا ھورھے تھے اور عالم اسلام پر مصیبتوں کے جو پہاڑ ٹوٹ رھے تھے اس نے ھندوستانی مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا کردی تھی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے ھندوستان کے مسلمانوں میں انتہائی جوش و خروش اور اضطراب پیدا کردیا تھا اسی زمانے میں مولانا شبلی اور علامہ اقبال نے بعض مشہور قومی نظمیں لکھیں اور مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ھمدرد کامریڈ اور الہلال کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور سرفروشی کا جذبہ پیدا کیا۔ ۵۷ء کے خونیں ھنگامے کے بعد اسلامی ھند سہما سہما نظر آتا تھا اور حالات کے تقاضے نے انہیں عارضی طور پر عملی سیاست سے الگ کردیا تھا۔ لیکن اب واقعات کا دھارا بدل چکا تھا اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف شروع سے دلوں کے اندر جو نفرت موجود تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر باھر نکل رھی تھی۔ ھندوستانی مسلمانوں کی ترک دوستی کی وجہ یہ تھی کہ اب تک دولت عثمانیہ کو اسلامی اتحاد کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اور یہاں کے مسلمان یہ ھی سمجھتے تھے کہ اگر ترکی سلطنت بچ گئی تو یہاں کے مسلمانوں کے استحکام میں بڑی مدد ملے گی۔ اس زمانے میں دیوبند کے علما نے بھی سیاست میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ جنگ آزادی کے نو برس بعد ھی ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی جو شاہ ولی اللہ کی تحریک کا مرکز بن سکے۔ چنانچہ اس دور میں نہ صرف دیوبندی جماعت نے ترکوں کی مصیبت میں مدد کی بلکہ علی گڑھ اور دیوبند والے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ھوئے۔ پہلی جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے دونوں جماعتوں نے متحد محاذ بنالیا تھا۔ جب جنگ شروع ھوئی تو عثمانی خلافت کو مدد

دینے کا فیصلہ کیا گیا اس پر مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو نظر بند کردیا گیا۔ اور شیخ الہند کو حجاز میں اسیر کرکے مالٹا بھیج دیا گیا۔

اسی زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ نے متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ع میں لکھنؤ میں دونوں سیاسی جماعتوں کا سمجھوتہ ہوگیا جو 'میثاق لکھنو، کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلہ میں قائد اعظم محمد علی جناح نے، 'جنہیں آگے چل کر اسلامی ہند کی قیادت سنبھالنی تھی، نہایت نمایاں کردار ادا کیا اور انہیں 'ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار، کہا گیا۔

جنگ ختم ہوئی تو ترکی خلافت قریب قریب ناپید ہوچکی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طاقت نے اسلام کی بین الاقوامی قوت کو ختم کیا ہے اسے زک پہنچائی جائے۔ چنانچہ مولانا محمد علی اور ان کے ہم خیال لیڈروں نے کانگریس میں شرکت کی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو اسلامی ملکوں سے برطانوی شہنشاہیت کی گرفت کچھ نہ کچھ ضرور ڈھیلی ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۲۰ع میں کانگریس اور تحریک خلافت کے تعاون نے برطانوی استعمار سے زبردست ٹکر لی۔ مولانا محمد علی کے الفاظ میں، اس وقت ہم نے مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت کے لئے آمادہ کیا اور ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمان اقلیت کا اتحاد کرادیا اور انہیں اس پر راضی کیا کہ ۱۸۸۷ع میں جو سیاسی پالیسی مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے سرسید احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ہندو اکثریت کی ذہنیت سے مجبور ہوکر اختیار کی تھی، اس کو بدل دیا جائے اور ہندو اور مسلمان اکثریت اور اقلیت دونوں ملکر انگریزی اقلیت کے استبداد کا خاتمہ کرے۔ اس جد و جہد میں مسلمان پیچھے نہیں رہے۔ خود مولانا محمد علی کے الفاظ ہیں ''حکام پرست بے شک ہمارے ساتھ نہ تھے لیکن حکام پرست ہندو بھی گاندھی جی کے ساتھ نہ تھے اور مسلمانوں

نے اپنی سیاسی اہلیت اور استعداد سے ثابت کردیا کہ ہندوستان کی قومی سیاست میں ان کا حصہ ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ رہے گا۔ اور ان کی قربانیوں نے بھی ثابت کردیا کہ قوم پروری میں وہ ہندوؤں سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لیکن اس عظیم الشان تحریک کو گاندھی جی نے چوری چورا کے حادثے کے بعد جس میں چند ہندوستانیوں کی طرف سے تشدد برتا گیا تھا، جس ڈرامائی انداز میں دفعتاً ختم کردیا اس کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ عین اس وقت جب کہ کانگریس اور خلافت کی عظیم تحریک نے غیر ملکی اقتدار کی بنیادیں ہلا رکھی تھیں، گاندھی جی نے ایک آن میں اس کا خاتمہ کردیا۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں کو سخت بھونچکا کیا اور آہستہ آہستہ مایوسی کے عالم میں کانگریس سے الگ ہوتے گئے۔

اسکے بعد ہندو مسلم اختلافات بڑھتے گئے اور کئی مختلف مقامات پر فسادات ہوئے۔ اس زمانے میں شدھی کی تحریک ہی نے مسلمانوں کو کانگریس سے برانگیختہ نہیں کیا بلکہ خود گاندھی جی کا مسلک ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک طرف وہ کانگریس کے سیاسی رہنما تھے تو دوسری طرف مذہبی رہنما بھی۔ انہوں نے ہندو مذہب کے احیا کو اپنا مسلک بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ان کا فلسفہ' زندگی کانگریس پر اثر انداز ہوتا چلا گیا تو دوسری طرف غیر ہندو جماعتیں بالخصوص مسلمان کانگریس سے بدظن ہوتے گئے، اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آل انڈیا کانگرس کے سکریٹری نے یہاں تک کہہ دیا کہ کانگریس ''گاندھی ازم،، کا دوسرا نام ہے، محض ایک سیاسی مسلک نہیں، بلکہ وہ ایک لائحہ' زندگی ہے۔ جس کو کانگریس میں رہنا ہو وہ ''گاندھی ازم،، کے اصول کو مانے، اور جو اس کے لئے تیار نہ ہو اس کی جگہ کانگریس میں نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کی جگہ واقعی کانگرس میں نہ رہی۔ ۱۹۲۸ع میں نہرو رپورٹ پر بحث کرنے کے لئے کلکتہ میں جو اجتماع ہوا، اس میں قائد اعظم نے کانگرس

سے اتحاد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ایسی ترمیمیں پیش کیں جنہیں تسلیم کرنے میں سرتیج بہادر سپرو ایسے اعتدال پسند لیڈروں کو کوئی اعتراض نہ تھا ۔ لیکن کانگرس کی مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والی قوتوں نے صلح و اتحاد کی اس دیانت دارانہ کوشش کو بھی ٹھکرادیا ۔ جب تمام کوششیں رائگاں گئیں تو ۱۹۳۰ع میں الہ‌آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہوا جس میں علامہ اقبال نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں ملک کی تقسیم کی تجویز پیش کی، جسے دس سال بعد مسلم لیگ نے اپنا نصب‌العین قرار دیا اور جس نے مزید سات سال بعد پاکستان کی شکل اختیار کی ۔

علامہ اقبال کا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی علیحدہ ایک مملکت ہونی چاہئے ۱۸۵۷ع کے بعد کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ھے ۔ سرسید کی علی گڑھ کی تحریک کے پس منظر میں یہ تصور موجود تھا ۔ دیوبند ، ندوۃ العلماء ، جامعہ ملیہ ، کی تحریکیں اس حقیقت کا بین ثبوت ھیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک الگ تہذیبی وجود ھے ۔ چنانچہ ۵۷ع کی جنگ آزادی کے بعد اگرچہ یہ حقیقت مختلف رخ اختیار کرتی رہی، لیکن تمام تحریکوں میں یہ قدر مشترکہ موجود رہی ۔ حقیقت یہ ھے کہ علامہ اقبال نے پاکستان کا جو تصور پیش کیا وہ اپنی موہوم شکل میں سرسید کے ان الفاظ میں بھی نظر آتا ھے جو انہوں نے ہندی اردو جھگڑے کے سلسلہ میں کہے تھے ۔ علامہ نے محض اس ذہنی رجحان کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جو پہلے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں موجود چلا آرہا تھا ۔ اور اس خوش آئند خواب کی تعبیر پاکستان کی صورت میں قائد اعظم محمد علی جناح کی کوششوں سے قوم کو ملی ۔

—*—

زبان

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی اپنے اثرات اور عواقب کے اعتبار سے بہت دور رس ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے ۱۸۵۶ع میں سلطنت اودھ کی ضبطی نے بہت سے ارباب بصیرت کے لئے سامان عبرت بہم پہنچایا تھا۔ لیکن پھر بھی دلی کے لال قلعے میں جھلملاتی ہوئی شمع سے بہت سے لوگوں کی امیدیں وابستہ تھیں۔ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ تھے اور قلعہ معلیٰ کی چہار دیواری میں بھی وہ اپنے قول و فعل میں آزاد نہ تھے، لیکن بہادر شاہ اس کے باوجود سلطنت کی عظمت کی نشانی تھے اور تحریک آزادی کے محور کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں بہت تھیں۔ سیاست کی بساط پر سے ان کا اٹھ جانا صرف ایک کمزور مغل بادشاہ کا خاتمہ نہ تھا اس کے ساتھ ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک تمدن کا تصور وابستہ تھا۔ ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کی ناکامی نے اس تہذیب معاشرت اور تمدن کی بنیادوں پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس کے بعد انتقامی کارروائیوں نے لوگوں کے حوصلے پست کردئے۔ ہمارے وہ علما جو علم و فن کے علمبردار اور ہماری تہذیب کے مظہر تھے جہاد کے فتووں پر دستخط کرنے کے الزام میں پھانسی پر لٹکائے گئے اور شرفا کا وہ طبقہ جو ہماری روایات کا وارث اور محافظ تھا قیام امن کے نام پر باغیوں کی

مدد کرنے کے الزام میں مٹا دیا گیا۔ غرض اس قیام امن میں جو کچھ گذری وہ شاید ہولناک جنگوں میں بھی نہ گذری ہوگی۔ یہاں سے ہماری سیاست، تعلیم، تہذیب و معاشرت، غرض زندگی کے پودے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان نئے اثرات میں سے جن کا تعلق براہ راست ہماری زبان سے ہے اس وقت میں ان کے بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مغربی قوموں اور ان کی زبانوں کے اردو پر اثرات کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے تجار کی حیثیت سے اس سر زمین پر قدم رکھا اور قدرتی طور پر ان کے ساتھ آئی ہوئی بعض اشیا اپنے نام بھی اپنے ساتھ لائیں۔ پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کا غلبہ وسعت اور مدت کے اعتبار سے بہت کم تھا اسلئے ان کے آثار بھی ہماری زبان میں کم ہیں۔ لیکن انگریزوں نے تجارت اور پھر سیاست میں اس طرح قدم جمائے کہ کم و بیش دوسو سال تک انہوں نے ملکی معاملات میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان اور بعد ازاں ان کے شعر و ادب نے اردو پر خاصا اثر ڈالا۔ اس اثر کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے، جب کلکتہ میں کمپنی کے نووارد ملازمین کو اس ملک کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج، عقائد و تصورات اور یہاں کے عوام کی گفتگو سے واقف کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور فورٹ ولیم کالج اس ضرورت کی تکمیل کے لئے قائم ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی مصنفین مثلاً میرامن وغیرہ انگریزی زبان یا ادب سے واقف نہ تھے۔ لیکن وہ گل کرائسٹ کی ہدایت اور مشورے کے مطابق کام کرتے تھے۔ اور انہیں کے مشورہ سے میرامن نے 'باغ و بہار' ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں لکھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ روز مرہ گفتگو کی عام زبان کو ایک اہم ادبی تحریر کے لئے اختیار کیا گیا۔ اور اس طرح اردو میں پہلی سلیس اور آسان اردو نثر کی کتاب معرض وجود میں آئی۔ میرامن کے علاوہ بھی

بعض مصنفین نے اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھیں۔ لیکن جو قبول عام اور شہرت دوام باغ و بہار کو نصیب ہوئی وہ کسی اور کتاب کے حصہ میں نہیں آئی۔ اسی زمانے میں بعض انگریزوں نے اردو کی لغات، صرف و نحو کی کتابیں اردو لسانیات اور اردو زبان کی تاریخ پر بعض کتابیں لکھکر اردو کے علمی مطالعہ کا آغاز کیا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کا حلقۂ اثر محدود اور اس ادارہ کے مصنفین کا مقصد مخصوص تھا۔ اس لئے ان نئے رجحانات نے اس وقت کسی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔ البتہ ۱۸۵۷ع سے کوئی پچیس تیس سال پہلے خود دلی میں ایک ایسا کالج قائم ہوا جہاں پہلی مرتبہ جدید علوم و فنون کی تعلیم مشرقی زبانوں میں دینے کا تجربہ کیا گیا۔ اور اس کے لئے انگریزی سے بعض درسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ترجمہ کرنے کے لئے ایک باقاعدہ دار الترجمہ تھا، جس نے نہایت واضح اصول اور ضوابط مرتب کئے۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا ایک اہم حصہ آہستہ آہستہ اردو میں منتقل ہونے لگا تھا۔ جس کے ساتھ زبان میں نئے الفاظ اور اصطلاحات کا بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ع کا ہنگامہ کالج اور اس کے دارالترجمہ کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

۱۸۵۷ع کی فتح نے انگریزوں کے حوصلے بلند کردئے اور انہوں نے نہایت بے دردی سے ملکی روایات اور قومی امنگوں کو کچل ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا۔ زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا وار یہ تھا کہ فارسی کی تہذیبی حیثیت کو ختم کردیا گیا۔ دفتروں، عدالتوں، تجارتی اور صنعتی اداروں میں فارسی کی جگہ انگریزی نے لی۔ جو دفتری اور عدالتی کاروائی عوام کے انگریزی سے نابلد ہونے کی وجہ سے مجبوراً اردو میں کی جاتی تھی، اس میں بھی آہستہ آہستہ انگریزی الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے۔ پھر انگریزی اب حکمراں طبقے کی زبان تھی۔ اس لئے انگریزی الفاظ کا استعمال مہذب ہونے کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح انگریزی کے جو الفاظ اردو میں آئے وہ تین طرح کے تھے۔ پہلے

وہ الفاظ جو دفتری یا عدالتی زبان سے تعلق رکھتے تھے اور جن کا استعمال خواص اور عوام دونوں کرتے تھے۔ ظاھرا یہ ایسے الفاظ تھے جو آھستہ آھستہ اردو میں گھل مل کر اردو بن گئے۔ مثلاً جج، کلکٹر، بالسٹر، (یعنی بیرسٹر)، کوٹ فیس (یعنی کورٹ فیس)، اشٹام (یعنی اسٹامپ)، ٹکٹ (ٹکٹ)، سمن (Summons)، ڈگری، جیل، رپٹ (رپورٹ)، پولس، کپتان (Captain)، کوٹ صاحب (یعنی Court Inspector)، ھائی کورٹ (یعنی عدالت عالیہ) اپیل (Appeal)، رنگروٹ (Recruit)، اردلی (Orderly)، وغیرہ۔ سینکڑوں الفاظ آج ایسے ھیں جن کے ترجمے کی ضرورت نہیں، اور جن کی اجنبیت آج ختم ھوچکی ھے۔

دوسری قسم کے الفاظ وہ ھیں جو ھماری عام تہذیبی اور سماجی زندگی سے تعلق رکھتے ھیں۔ ان میں اکثر ان چیزوں کے نام ھیں جو انگریزوں کے ذریعے سے ھم تک پہنچیں۔ مثلا پھلوں میں سنترہ (Cintra)، مالٹا (Malta)، موسمبی (Mosambique)- سبزیوں میں ٹماٹر وغیرہ۔ بسکٹ، توس اراروٹ، ڈبل روٹی، وغیرہ۔ لباس میں کوٹ، کالر پتلون، ٹائی، بٹن وغیرہ۔ غرض اس ضمن میں بھی بے شمار الفاظ ھیں جو خاص و عام کی زبان پر رواں ھوگئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کا استعمال ۱۸۵۷ع کے بعد کی تصانیف میں بھی ملتا ھے۔ الفاظ کا تیسرا اور نہایت اھم ذخیرہ ادبی، علمی اور فنی الفاظ کا ھے جن کا سلسلہ تو دلی کالج سے شروع ھوتا ھے لیکن جن میں ۱۸۵۷ع کے بعد ھی خصوصیت کے ساتھ اضافہ ھوا ھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں کی تحریک کا ذکر کرنا چاھئے۔ ۱۸۵۷ع کے ھنگامہ کے بعد یہ سب سے پہلی تعمیری تحریک تھی جو اس برعظیم میں شروع ھوئی، بعض لوگ سرسید کو انگریزوں کا آلۂ کار سمجھتے ھیں، لیکن ایمان کی بات یہ ھے کہ سرسید کے پیش نظر مسلمانوں کی بالخصوص اور اھل ھند کی بالعموم اصلاح تھی اور ان کا یہ خلوص ان کی تمام تحریروں میں جھلکتا ھے۔ یہ درست

ہے کہ وہ انگریز اور انگریزی کے ساتھ تعاون کے علمبردار ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو رخنہ پڑگیا تھا اور جس کی وجہ سے مسلمان خصوصیت کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد منتقمانہ کاروائیوں کا شکار ہورہے تھے اس کے روکنے کی صرف ایک یہی صورت تھی۔ دونوں کو قریب تر لانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ انگریزوں اور انگریزی کے خیالات اور تصورات کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک اخبار اور ایک رسالہ نکالا یہ اخبار ان کی قائم کردہ ''سائنٹیفک سوسائیٹی،، کا ترجمان تھا اور لوہے کے چھاپے میں چھپتا تھا۔ اس کا ایک حصہ انگریزی میں اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا۔ معلوماتی مضامین علمی تجربات، سیر و سیاحت کے حالات غیر ملکوں کی خبریں ایجادات اور انکشافات کی اطلاعات عام طور پر اس اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن اخبار سے زیادہ مشہور اور اہم ان کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق،، تھا جو انگریزی جرائد اسپیکٹر اور ٹیٹلر کے انداز پر نکالا گیا تھا۔ اس میں ایڈیسن اور اسٹیل کے لکھے ہوئے مضامین کا ترجمہ ہوتا تھا۔ سرسید اور ان کے دوسرے مضمون نگار بھی اسی قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی زبان پر قدرتی طور پر بہت سے انگریزی الفاظ آجاتے تھے، مثلاً سرسید کے صرف ۱۹ منتخب مضامین میں یہ الفاظ موجود ہیں :—

یونیورسٹی، ڈگری، بی اے، ایم اے، ماسٹر، سوسائیٹی، کالج، لکچر، سوشل، سر، مسٹر، پروفیسر، سائینس، ٹیکنیکل ایجوکیشن، گورنمنٹ، ڈاکٹر، ڈاکٹری، انجنیر، سائینس، آرٹیکل، پارلی منٹ، آنریبل ممبر، ہاؤس آف کامنز، نیچر، رومن کیتھلک، پروٹسٹنٹ، نیشنل لا، تھرما میٹر، بگل، سولزیشن، ٹیسٹ (Taste)، گورنر جنرل، کونسل، ووٹ، آئر لینڈ، پیٹریاٹزم، سولائزڈ، ان‌سولائزڈ، سلف، آنر، اگریسو۔

سرسید کے دوسرے مضامین اور مقالات کا جائزہ لیا جائے

تو یہ فہرست اور طویل کی جاسکتی ہے۔

سرسید کے بعد حالی کو لیجئے۔ سرسید نے تو انگلستان کی سیر کی تھی وہاں کی یونیورسٹیوں کا بغور مطالعہ کیا تھا اور خود اسی قسم کی یونیورسٹی یہاں قائم کرنا چاہتے تھے۔ سرکاری ملازمت کی مدت میں بھی انہیں انگریزوں سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ حالی بیچارے کو انگریزی سے براہ راست واقف ہونے کا موقع نہ تھا لیکن زمانے کا رجحان دیکھئے کہ سرسید کے معاصرین میں سب سے زیادہ انگریزی الفاظ حالی کے یہاں ہی ملتے ہیں۔ مثلاً مضامین کے ایک مختصر مجموعے میں کم از کم اتنے الفاظ موجود ہیں :

گاس (یعنی gas) اوکسیجن، ھائیڈروجن، ہومر، فیثا غورس کیمبس، اتھوپیا، لوشین، ال ال ڈی، کارسپانڈنٹ، آرٹیکل، پلین۔ ٹیبل، لٹریچر، سوپر نیچرل، نیچرل "Impossible is nothing" نیچرل، ان نیچرل، ڈکشنری، پالیسی، رفارمر، کرسٹان، کمیٹی، لارڈ لوتھر، پوپ، ھائی ایجو کیشن، سولیزیشن اوریٹر، ڈاکٹر، پولیٹیکل، لمپ، ممبر، پریکٹیکل، گریجویٹ، سلف، سولائزڈ، ھاف سولائزڈ، ایجوکیشن، بورڈنگ ھاوس، جنیوا، پولیٹیکل ایجنٹ اسپیچ، ریویو، ریویو نگار، پبلک، جیوگرفی، رومن لا، فلوز فی، میونسپل کمیٹی، سوسائیٹی، کیمبرج، فزیکل سائینس، سلف ھلپ کانشنس، مشنری پریچنگ، سوشل، لائلٹی، لائف، ایسے، ایجوکیٹیڈ، لا آف نیچر، جنرل انفارمیشن، بیوگریفی، ریمارک، اوریجنل وغیرہ۔

کم و بیش پچھتر (۷۵) الفاظ تقریباً ۲۵۰ صفحات میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اوسطاً ہر صفحہ میں چار انگریزی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ حالی کے دیگر معاصرین میں اس کی اتنی کثرت نہیں مثلاً حالی کے بعد مولانا شبلی کا نمبر ہے لیکن وہ انگریزی الفاظ استعمال کرتے وقت ان کے مترادفات بھی دیتے ہیں۔ اس کے بعد آزاد اور پھر

مولوی نذیر احمد آتے ھیں ۔ غرض ان لوگوں کی بدولت انگریزی کے بے شمار الفاظ علمی اور ادبی اردو زبان میں داخل اور رواں ہوگئے ۔ لیکن یہ تمام الفاظ صرف اجنبی لغات کی حیثیت سے اردو میں شامل نہیں ہوئے بلکہ اپنے ساتھ نئے تصورات نظریات اور نئی تشریحات لے کر آئے ۔ ان کے پردے میں ایک نئی تہذیب ایک مختلف معاشرت ایک نئے ادب اور انشاء کی جھلک بھی موجود تھی ۔ سرسید اور حالی دونوں کے یہاں ایسے الفاظ کی کثرت ہے جن کا تعلق بقول ان کے سوشل امور سے ہے ۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ سماج کے مغربی تصورات اور نظریات ان کی تحریروں کے خاص موضوعات تھے ۔ مغربی مصنفین، مفکرین ، شعرا ادیبوں سیاسی کارکنوں صحافیوں اخبار نویسوں اور مصنفوں کے نام جو ابھی آپ نے اس فہرست میں سنے، نئے خیالات اور تصورات کا سرچشمہ ھیں اور یہ تمام خیالات جن کا تعلق اصلاح معاشرت اصلاح زبان اور اصلاح ادب سے ہے، اردو میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی بدولت ھی رائج ہوئے ۔

ظاہر ہے مغرب سے مضامین اور خیالات ترجمہ کرنے میں ارادی اور غیر ارادی طور پر یہ تمام مصنفین بعض نئی اصناف اور شعری و ادبی پیمانوں سے آشنا اور متاثر ہوئے مثلاً ''ایسے،، اور ''آرٹیکل،، جیسے مغربی رسالوں اور اخباروں میں ہوتے تھے ۔ ان کا ایک خاص انداز تھا ، جو اردو کے مضامین سے مختلف تھا ۔ ان نئی اصناف کے لئے ظاہر ہے اردو کا کوئی موزوں لفظ اس وقت تلاش کرنا مشکل تھا ۔ اگرچہ آج بھی ہم صحافت میں اڈیٹر، کالم، نوٹ، کارٹون اور بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کرتے ھیں ، لیکن اب بعض پرانے اردو الفاظ بھی ان مطالب کے لئے ادا ہونے لگے ھیں ۔ مثلاً ''ایسے،، کے لئے مضمون یا مقالہ، ایڈیٹر کے لئے مدیر، لیڈنگ آرٹیکل کے لئے مقالہ افتتاحیہ وغیرہ ۔

مغربی مصنفین کے ناموں اور ان کے کاموں کے ساتھ ساتھ اس دور میں اردو مغربی زبانوں خاص طور پر انگریزی کے طرز ادا

سے بھی متاثر ہوئی۔ سرسید نے اڈیسن اور اسٹیل کے جن مضامین کا ترجمہ کیا ظاہر ہے ان کی بدولت اڈیسن اور اسٹیل کے طرز کی کچھ نہ کچھ جھلک ہماری زبان میں بھی آگئی ہوگی۔ اس طرز کی سب سے نمایاں خصوصیت مقصد نگاری سادگی اور صاف گوئی ہے۔ یہ سادگی میرامن کی باغ و بہار کی سادگی سے مختلف ہے۔ میرامن کی زبان صاف و سادہ، دلی کی با محاورہ اور مستند زبان سہی، لیکن خود بقول ان کے عوام کی روزمرہ کی ٹھیٹھ گفتگو ہے۔ اس لئے اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ علمی انداز بن سکے۔ سرسید اور حالی کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ متانت سنجیدگی اور ایک علمی وزن و وقار پایا جاتا ہے۔ اس طرز کی مقبولیت نے زبانوں کو جو رجب علی بیگ سرور اور ان کے ہمرنگ انشا پردازوں کی رنگین بیانی کے عادی ہوچکے تھے، سادگی اور دلنشینی کے طرز سے آشنا کرایا۔ سرسید کے "تہذیب الاخلاق" سے سر عبدالقادر کے "مخزن" تک اسی تحریک کی بدولت نئے مضامین اور نیا طرز سارے ملک میں پھیلا اور یہ ممکن ہوا کہ اردو نثر، جس کا سرمایہ سرسید سے پہلے کی چند مذہبی طرز کی تصانیف یا قصے کہانیوں پر مشتمل تھا، اس قابل ہوگئی کہ اس میں دنیا کے تمام جدید علوم و فنون پر مضامین، مقالے اور کتابیں لکھی جاسکیں۔

۱۸۵۷ع پر پوری ایک صدی بھی نہیں گزرنے پائی تھی کہ انگریزوں کو اس ملک سے رخصت ہوجانا پڑا اور پاکستان و ہندوستان نے سیاسی آزادی حاصل کرلی۔ برطانوی اقتدار کے اثرات ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں اور شاید آئندہ نسل تک یہ نقوش نہایت دھندلے رہ جائیں گے۔ لیکن ہماری زبان نے جو نئے اثرات قبول کئے ہیں ان کے نتائج اور عواقب نہایت دور رس ثابت ہوں گے۔ انگریزی سے نئے الفاظ کا داخلہ تقریباً ختم ہوجائے گا۔

لیکن اردو کو انگریزی کی جگہ لینے کے لئے انگریزی سے بہت کچھ لینا پڑے گا۔ اصطلاحات کے ترجمے ہونگے درسی

کتابوں کے ترجمے ہوں گے۔ دفتری اور عدالتی زبان میں نئی اصطلاحیں بنائی جائیں گی۔ جدید علوم و فنون کی زبانیں جو آج دنیا کے مختلف علاقوں میں لکھی جارہی ہیں انگریزی کے ذریعے سے ہم تک پہنچینگی اور پھر ان کے مضامین اور خیالات کا ترجمہ ہوگا اور اس طرح ہماری زبان اپنی ترقی کے امکانات کو حقائق میں بدل سکیگی۔

--*--

ادب

سید عابد علی عابد

۱۸۵۷ع کا ہنگامہ جسے انگریز مورخ غدر کہہ کر پکارتے ہیں کوئی اتفاق حادثہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دن سے انگریزوں نے ہندوستان پر پاؤں جمائے تھے اسی دن سے تحریک آزادی کی چنگاریاں بھی سلگنے لگی تھیں ۔ مسلمانوں کے دل سے طبعاً اغیار کی حکومت کے برخلاف جذبے کا رنگ چوکھا تھا ۔ کیونکہ انگریزوں نے انہی کی عظمت کے خوابوں پر اپنی بنائے مملکت استوار کی تھی ۔ بہر حال ۱۸۵۷ع زندگی پر گہرے اور دیر پا اثرات پیدا کرکے رفع ہوگیا جن دنوں تحریک آزادی عروج پر تھی ، انہی دنوں انگریز مدبروں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کے رہے سہے اقتدار کو ملیامیٹ نہیں کردیا جائے گا انگریزی حکومت کی بنیادیں استوار نہیں ہوں گی ۔

تحریک آزادی کے فرو ہونے کے بعد انگریزوں کی نئی حکمت عملی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ مسلمان امیروں اور جاگیرداروں کی ریاستیں ختم کردی گئیں ۔ مسلمانوں کو چن چن کر تہ تیغ کیا گیا ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی آخری علامت یعنی بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج دیا گیا ، اور صحیح معنی میں برعظیم ہند و پاکستان میں فرنگی عملداری قائم ہوگئی ۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک مقام تھا۔ ایک تو یہ

کہ وہ سیاسی طور پر کچلے جارہے تھے ۔ دوسرے یہ کہ اقتصادی
طور پر بھی ان کو بے حال بنانے کی کوششیں جاری تھیں ۔
اسوقت سرسید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ایسے اسلوب
سے رہنمائی کی کہ باید و شاید ۔ سرسید نے بجا طور پر محسوس کرلیا
تھا کہ اغیار اس موقع پر ہر اس تحریک کو سختی سے کچل دیں
گے جس میں کسی سیاسی عنصر کی آمیزش ہو یا جو مسلمانوں
کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ اس
لئے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے بچے کھچے ذوق عمل کا رخ
موڑ کر ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس سے حیرت انگیز اثرات
رونما ہونے والے تھے ۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اغیار
ہی کے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر حملہ کیا جائے اور اس حملے
کی رفتار ایسی ہو کہ جب تک کاری اور مہلک ضرب لگانے
کا مقام نہ آئے اس وقت تک اغیار خطرے کی نوعیت سے بالکل با
خبر نہ ہونے پائیں ۔

سرسید احمد خاں نے اس حملے کے مقدمات یہ قرار دئے :

(۱) مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی علوم و فنون
سے باخبر کیا جائے تاکہ وہ مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو
کامیابی سے روک سکیں ۔

(۲) مسلمانوں کے دل میں اپنی تمدنی اور ثقافتی عظمت
کا احساس پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی جرأت
کو دوبارہ حاصل کرنے میں کوشاں ہوں ۔

(۳) تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو آہستہ
آہستہ ایسی ارتقا یافتہ شکل دی جائے کہ وہ اغیار کی حکومت
کا جوا آہستہ آہستہ اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں ۔

سرسید احمد خاں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے
طبعاً ادب کا وسیلہ ڈھونڈا اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے ارد گرد
ایسے لوگوں کو جمع کرلیا جو ہر طرح ان کے محرم راز تھے ۔
انہیں لوگوں نے تخلیقات ادب کے ذریعے آہستہ آہستہ وہ چنگاریاں

سلگائیں جن کو شعلے بنکر برعظیم ھند پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لینا تھا۔ سرسید احمد خاں کا منصوبہ کتنا منظم تھا، اسکا اندازہ صرف اسی سے ھوسکتا ھے کہ آزادی کی جد و جہد کے اب تک جتنے چشمے پھوٹے ھیں ان کا مأخذ و منبع انھی لوگوں کی تحریریں تھیں جو سرسید کے رفقائے کار تھے۔ ذرا غور کیجئے گا۔ مذھب کے معاملے میں تنگ نظری رفع کرنے کے لئے خود سرسید نے قرآن مجید کی ایک نئی تفسیر لکھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے مخالفتیں بھی برداشت کیں، ان کے خلاف کفر کے فتوے بھی صادر ھوئے، لیکن وہ برابر اپنے کام میں لگے رھے۔ یہاں تک کہ اکبر الہ‌آبادی کو بھی جو ان کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے کہنا پڑا:

دل ترا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

سرسید کے رفقا سے جس شخص نے سب سے زیادہ بے لوثی سے مسلمانوں کی خدمت کی اور سرسید کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اعانت کی اسے تاریخ حالی کہہ کر یاد کرتی ھے۔ حالی کی نثری اور شعری تخلیقات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ھوگا کہ وہ قوم کو ایک نئے حملے کے لئے تیار کر رھے ھیں اور ظاھر ھے کہ اس حملے سے مراد یہ تھی کہ ۱۸۵۷ع کی چنگاریوں کو پھر سلگایا جائے تاکہ آخرکار مسلمان اغیار کی حکومت سے نجات حاصل کرکے اپنی تمدنی اور سیاسی میراث کو دوبارہ حاصل کرسکیں۔ مسدس میں اس مقصد کے حاصل کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ھے۔ اس کتاب کا اسلوب، انداز بیان، زاویۂ نظر، مطالب و معانی، ترتیب، سب اس بات کی شہادت دیتے ھیں کہ اگرچہ حالی انگریزی حکومت کی برکتوں کے گن بھی گاتے تھےاور یہی مصلحت تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کرتے تھے کہ ان

برکتوں سے ٹھیک طریقے پر بہرہ یاب بھی ہوں۔ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی غالباً اردو میں یہ پہلی منظم کوشش تھی اور اس میں حالی کا طریقہ پیچدار تھا۔ رفتہ رفتہ حالی نے اقبال کی ہنگامہ آرائی کے لئے فضا ہموار کی۔ حالی کی بعض سیاسی نظمیں اور جدید غزلوں کے بعض اشعار نہایت معنی خیز ہیں مثلاً :

صلح ہے یا مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو خالی یاں تفنگ

کبک و قمری میں یہ جھگڑا ہے چمن کسکا ہے
کل خزاں آکے بتادے گی وطن کس کا ہے

ڈاکٹری معائنے کے سلسلے میں کالے اور گورے کے فرق پر جو انہوں نے مختصر سی نظم لکھی ہے، بہت معنی خیز ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اقبال نے مغرب کی تہذیب کو مغربی افکار سے مسلح ہوکر جس طرح غارت کرنے کی کوشش کی ہے، حقیقت میں وہ حالی ہی کا فیضان ہے۔ حالی کے شریک کار ادیبوں میں شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد بھی تھے۔ جو ڈپٹی نذیر احمد کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ جنگ آزادی کی ناکام تحریک کے بعد جب سرسید احمد نے مسلمانوں کے تمدنی اور تعلیمی احیا کا بیڑا اٹھایا تو نذیر احمد نے غالباً سب سے زیادہ ان کا ہاتھ بٹایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کوئی قوم صحیح معنی میں اس وقت تک تمدنی اور سیاسی سوجھ بوجھ کی حامل نہیں ہوسکتی جب تک اس قوم کی عورتیں تعلیم یافتہ اور مہذب نہ ہوں۔ نذیر احمد نے اپنے افسانوں، ناولوں اور تحریروں کے ذریعے عورتوں کو یہ ترغیب دلائی کہ وہ تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب ہوں۔ اور ان نونہالوں کو اپنی آغوش شفقت میں پروان چڑھائیں، جنہیں ایک نئی جنگ آزادی میں حصہ لینا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو عورتوں کی تربیت کا کتنا خیال تھا اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 'توبۃ النصوح' میں انہوں نے عورتوں کی کردار کشی

میں نہ صرف احتیاط اور چابک دستی سے کام لیا ہے بلکہ ان کو مردوں کی اصلاح پر مقرر کیا۔ غالباً ان کی کتاب ''امہات الامہ،، بھی عورتوں میں اپنے صحیح مقام کا شعور پیدا کرنے کی جو کوششیں انہوں نے کی تھیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ع کے بعد مسلمانوں کے استیصال کی جو منظم کوشش کی گئی تھی اس کو ناکام بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی گذشتہ عظمت یاد دلائی جائے تاکہ انہیں احساس ہو کہ وہ کن کن انقلابات سے گذر کر کن کن مقامات تک پہنچے۔ اسی بات کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے دل میں یہ یقین پیدا کیا جائے کہ ان کے علمی اور فنی ادارے اپنے زمانے کے اعتبار سے مغرب کے اداروں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معلومات حاصل ہونے سے ہمارے دل میں بجا طور پر یہ خیال آتا ہے کہ ہم تہذیب مغرب کے محتاج نہیں ہیں اور ہم نے بھی مملکت داری اور جہانبانی کے اصولوں کو سمجھا اور برتا ہے۔ سرسید کی نگرانی میں یہ کام شبلی نعمانی نے انجام دیا ان کی تصانیف ''المامون،، ''الفاروق،، اور ان کے مختلف مضامین جو ''رسائل شبلی،، کے عنوان سے شائع ہوچکے ہیں، سب کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تمدنی میراث کی ہمہ گیری سے آگاہ کیا جائے۔ سچ پوچھئے تو ان کی کتاب ''سیرت النبی،، بھی جنگ آزادی ہی کی تحریک کا رد عمل تھی۔ ۱۸۵۷ع کے بعد انگریزی عملداری قائم ہوجانے سے جو دور رس نتائج پیدا ہوئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگ مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور اس بیگانگی کے پیدا کرنے میں ان مورخوں اور پادریوں کی تحریروں کا بہت حصہ تھا جو رسول اقدس کی زندگی کے واقعات کو مسخ کرکے پیش کرتے تھے۔ ''سیرت النبی،، ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دینے کی کوشش ہے جو غیروں نے اسلام کے پیمبر اور اسلامی نظام حیات پر کئے تھے۔

سرسید کے دور ھی میں اکبر نے اپنا جہاد اکبر شروع کردیا تھا۔ اس کا کلام گویا حالی اور اقبال کے کلام کے درمیان نہایت اہم درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ھے اکبر کو سرسید سے اختلاف تھا۔ یہ اختلاف حصول مقصد سے نہ تھا، طریق کار میں تھا اور کچھ یہ بھی تھا کہ اکبر نے سرسید کی تحریک کی غائت سمجھنے میں مجتہدانہ غلطی کی۔ بہرحال مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی شعور کے احیاء میں اکبر کا بہت بڑا حصہ ھے۔ ان کی بغاوت مغربی تہذیب، تمدن، تعلیم اور یہاں تک کہ سائینس کے خلاف بھی تھی۔ یوں ان کے کلام میں افراط کی ناھمواری پائی جاتی ھے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ھوں اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مغرب کے قائم کردہ تہذیبی، تربیتی اور علمی اداروں کے نقائص کو کھول کھول کے بیان کیا اور یوں ھمارے دل میں احساس پیدا کیا کہ جس چیز پر ھم دیوانہ وار مر مٹے ھیں وہ اتنی والہانہ شیفتگی کی سزاوار نہیں۔ ان کی نظم ''دھلی دربار،، نہایت معنی خیز سیاسی اشاروں پر مشتمل ھے۔ یہ بند سنئے گا:

اوج بخت ملاقی ان کا چرخ ھفت طباق ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا آنکھیں میری باقی ان کا

''برق کلیسا،، میں انھوں نے جس لطافت اور خوبی سے اس قیمت کا ذکر کیا ھے جو مسلمانوں کو حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے میں ادا کرنی پڑی، اسکی نظیر اردو ادب میں ملنی مشکل ھے۔ ''برق کلیسا،، تہذیب فرنگ ھے کہ مسلمان سے ذوق عمل، سیاسی شعور، جہاد کی تمنا، ایمان کا احساس، چھین لینا چاھتی ھے اور اس کے بدلے کچھ دولت دنیوی اور کچھ اعزاز منصبی عطا کرتی ھے۔ ''برق کلیسا،، کہتی ھے۔

غیر ممکن ھے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ھے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ھیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ھیں غازی بنکر

بیچارہ مسلمان کہتا ہے :

جوہر تیغ مجاهد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینہٴ رو پہ نثار
میرے اسلام کو اک قصہٴ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ توپھر مجھ کوبھی راضی سمجھو

حالی اور اکبر کے بعد اقبال نے مسلمانوں کو ایک نئی جنگ آزادی کے لئے تیار کرنے کے لئے اپنی تمام شعری استعداد اور اپنی غیر معمولی ذهانت کو اس طرح صرف کیا کہ اس کا کلام اس ذهنی بیداری کی علامت بن کر رہ گیا جس کے پیدا کرنے میں حالی اور سرسید نے اتنا نمایاں حصہ لیا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ اقبال بھی اسی شعری تحریک کی پیداوار ہے جو ۱۸۵۷ع کے بعد شروع ہوئی تھی لیکن اس کا اسلوب اپنے پیش رووٴں سے مختلف ہے۔ اقبال کے پیشرو ہمارے ذہنوں کو آزاد کرنا چاہتے ہیں اور تہذیب مغرب کے مقابلے میں مشرق تمدن کو پیش کرتے ہیں ۔ اقبال ایسا بھی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کرتا ہے کہ مغرب کے تمام علوم و فنون سے مسلح ہوکر مغرب کے فلسفے اور منطق کی تمام موشگافیوں سے کام لے کر مغربی تہذیب کے تمام نکات سے باخبر ہوکر تہذیب مغرب پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے کہ یہ بت سنگیں پاش پاش ہوکر گر پڑتا ہے ''ضرب کلیم،، کا ذیلی عنوان ہے کہ : ''اعلان جنگ عصر حاضر کے خلاف،، اور ظاهر ہے کہ عصر حاضر، تہذیب فرنگ کا عصر ہے۔ فرنگی سامراج کا دور ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کرتا بلکہ تحریر اور تقریر کے ذریعے مسلمانوں کے لئے ایک خطے کا مطالبہ کرتا ہے جہاں وہ اپنے ملی اور قومی خصائص کو برقرار رکھ سکیں اور اقتصادی طور پر پروان چڑھ سکیں۔ اقبال ہی نے آخری دور میں ہمارے ذهن کے تمام جالوں کو صاف کیا۔ مشرق میں جو زندگی کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں ان کو ہوا دی۔ ہمیں اپنی تمدنی میراث کی عظمت سے بخوبی با خبر کیا اور آهستہ آهستہ ہمیں ایسے مقام

پر لے آیا جہاں ۱۸۵۷ع کی جنگ آزادی کی تحریک مطالبۂ پاکستان کی شکل اختیار کرگئی ''ضرب کلیم،، میں وہ کہتا ہے:

سخت باریک ہیں امراض امم کے اسباب
کھول کر کہئیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دین خیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی

اقبال کی مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی رفتار میں خود اپنے گمراہ امام اور شیوخ حائل ہیں۔ قیادت کا وہ بھی قائل ہے امامت کی حقیقت کا وہ بھی معترف ہے، لیکن وہ مسلمانوں کی باگ ڈور اس نازک دور میں اس شخص کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے جو امتوں کے امراض سے با خبر ہو اور ان کے علاج پر قادر ہو۔ یہ کام اس ملا کا نہیں جو بحث و جدل کو منصب حیات تصور کرتا ہے۔ اس شیخ کا نہیں جو خانقاہوں میں قوالی کی محفلوں کو حاصل زیست سمجھتا ہے۔ اس مدرس کا نہیں جو شاہیں بچوں کو خاک بازی کا درس دیتا ہے۔ بلکہ اس مرد قلندر کا ہے جو سلطان جابر کے حضور میں نعرۂ حق بلند کرتا ہے، کہ اس سے بڑا جہاد تصور میں نہیں آسکتا۔ اقبال نے اپنی مختصر نظم ''کرامات،، میں ان تمام تحریکوں کو مہلک قرار دیا ہے جو سلاطین وقت کی پرستاری سکھاتی ہیں اور امام وقت اسی کو تسلیم کیا ہے جو آبرو کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام بر حق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھکو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

سب جانتے ھیں کہ امت مسلمہ کو برعظیم ھند و پاکستان میں ایسا ایمان اور ایسا قائد — قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم و مغفور کی صورت میں نصیب ھوا، جس کی ذات گرامی مسلمانوں کی ھر جنگ آزادی کی ایک دلنشیں علامت بنکر رہ گئی تھی۔ ۱۸۵۷ع سے لیکر ۱۹۳۰ع تک ادب اور ادبی تخلیقات جس مرد قلندر کے ظہور کی نوید دے رھی تھیں آخر اس کا کوکب اقبال طلوع ھوا اور حریفوں کے تمام ستارے ماند پڑ گئے۔ اقبال کو مرنے سے پہلے بہ تحقیق معلوم ھوچکا تھا کہ مسلمان جس نازک دور سے گذر رہے ھیں اس میں ان کی راھنمائی خدا نے ایسی ذات گرامی کے ذمے کردی ھے جو نہ طوفان سے گھبراتا ھے اور نہ خدا کے سوا کسی اور طاقت کے سامنے سرجھکاتا ھے۔ ”ارمغان حجاز،، کی بعض نظموں سے معلوم ھوتا ھے کہ اقبال نے اس آنے والے انقلاب کو دیکھ لیا تھا جس کی طرف مسلمان تیزی سے بڑھے جارہے تھے۔ وہ باخبر تھا کہ مغرب میں جو کچھ ھورھا ھے مشرق پر اس کے نتائج ضرور برآمد ھوں گے اور برعظیم ھند و پاکستان بھی اس انقلاب سے ضرور متاثر ھوگا جو ایک دوسری جنگ عظیم کے بعد برپا ھوگا۔ یہاں تک کہ ھمالہ کے چشمے بھی ابلنے لگیں گے۔ اقبال کہتا ھے :

دگرگوں جہاں ان کے زور عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

منجم کی تقویم فردا ہے باطل
گرے آسماں سے پرانے ستارے

ضمیر جہاں اسقدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے

زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے "ولر" کے کنارے

—*—

دہلی کے اخبارات

(خلیل الرحمان داؤدی)

''گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا سینہ غم سے فگار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹادیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تلے کہو خار غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بیگناہ
ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے غبار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہو کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے''

یہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار، بہادر شاہ ظفر کا کلام بتایا جاتا ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کھانے کے بعد دہلی کی حالت زار پر کہا گیا*۔ یوں تو اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد ھی سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوگیا تھا، لیکن ۵۰ سال تک اس کی رفتار دھیمی رہی۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین ایک فیصلہ

---

* لیکن در اصل دلی کے ایک غیر معروف، ناخواندہ شاعر ''حسامی'' کا کلام ہے

کن جنگ تھی۔ اس کے بعد دھلی کی سلطنت صرف دارالخلافہ کے نواح تک ہی محدود ھو کر رہ گئی تھی اور انگریزوں کا اثر و اقتدار تمام ملک پر اپنا تسلط جما رہا تھا۔ گو سلطنت مغلیہ برائے نام تھی لیکن برصغیر پاک و ہند میں میسور، روھیلوں اور مرھٹوں کی طاقتیں ایسی ضرور تھیں جنھوں نے ایک عرصہ تک فرنگیوں کو زحمت پنجہ آزمائی دی۔ فرنگیوں کی خوش بختی سے یہاں کا باھمی افتراق ان کی فتح و کامرانی کے لئے سازگار ثابت ھوا۔ جوں جوں انگریزوں کے قدم جمتے جاتے تھے اس برصغیر کے باشندوں کے دل ان کی طرف سے متنفر ھوتے جاتے تھے۔ انگریزوں کی تبلیغی جماعتیں نہایت آزادی سے اپنا کام کررھی تھیں۔ ان کے قوانین ھمارے مذھبی احکامات سے ٹکراتے تھے۔ ان کی ھوس ملک گیری یہاں کی تمام آزاد ریاستوں کو یکے بعد دیگرے ھڑپ کر رھی تھی۔ فوج میں یہاں کے باشندوں کے ساتھ ان کے امتیازی سلوک سے فوجیوں کے دل آتشیں غیظ سے کباب ھورھے تھے۔ چنانچہ پبلک کو اس کا یقین ھوگیا تھا کہ وطن کے جانے کے ساتھ دین و ایمان کی بھی خیر نہیں۔ انگریزوں کے خلاف یہ جذبۂ نفرت و عناد ۱۷۵۷ع کی جنگ پلاسی سے پیدا ھوا اور تقریباً سو سال تک یہاں کے عوام کے دلوں میں اپنا گھر کئے رھا۔ عوام موقع کے منتظر تھے۔ چنانچہ ٹھیک ۱۰۰ سال بعد ۱۸۵۷ع میں اس برصغیر کے باشندے کفن سر سے باندھے، جان ہتھیلی پر لئے، حریت وطن اور حریت دین کی خاطر میدان میں اتر آئے۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ع کو میرٹھ چھاؤنی سے فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کیا۔ اھالیان دھلی نے لبیک کہا اور آن کی آن میں یہ آگ تمام ھندوستان میں پھیل گئی۔ میرٹھ، دھلی، جھانسی، کانپور اور لکھنؤ جو کہ فرنگیوں کے فوجی مرکز تھے، اس جنگ آزادی کے بھی مرکز خصوصی ھو کر رہ گئے۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ عرصۂ دراز سے ٹمٹما رھا تھا۔ لیکن پھر بھی دھلی کو پایہ تخت اسلامی ھونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لئے

جنگ آزادی کا بھی سب سے زیادہ زور اسی با نصیب شہر کو جھیلنا پڑا۔ ۵۷ء کی جنگ آزادی کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو دفعتاً رونما ہو گیا ہو۔ اس کے پس منظر میں انگریزوں کی ہوس ملک گیری، ان کی سازشیں، نوابوں اور راجاؤں کے ساتھ ان کی عیاریاں اور مسیحیوں، کی تبلیغی سرگرمیاں اور نئے آئین و دستور تھے۔ یہ کہئے کہ فرنگیوں کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت و حقارت کا لاوا ایک عرصہ سے پک رہا تھا۔ منہ کھلنے کی دیر تھی۔ چنانچہ ۵۷ء میں اس کی نوبت بھی آ ھی گئی۔ اس لئے جنگ آزادی سے متعلق وقتی چیزیں زیادہ اھمیت نہیں رکھتیں بلکہ اس کا صحیح جائزہ لینے کے لئے اس سے کم از کم چند ماہ پیشتر کی اطلاعات بھی ملحوظ رکھنی ہونگیں۔ ۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے دلی کے اخباروں میں ضرور بہت کچھ شائع ہوا ہوگا جسے ہم اسباب کے طور پر دیکھ سکتے ھیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ ۵۷ء یا اس کے بعد کوئی اخبار بھی یہ جرأت کرسکا ہو کہ جنگ آزادی یا انگریزوں کے خلاف کچھ لکھ سکے۔

انگریزوں کو اپنے متعلق عوام کی بد ظنی کا اچھی طرح علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے ''اسباب بغاوت ہند،، میں نہایت مدلل پیرایہ میں یہ واضح کردیا ہے کہ یہ انقلاب کسی وقتی سازش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کی ذمہ داری خود فرنگیوں پر عاید ہوتی ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب میں ایک اشتہار بھی حکومت بنگال کی طرف سے جاری کردہ نقل کیا ہے جس میں حکومت نے عوام کو اس قسم کی بے چینیوں کی طرف سے اطمینان دلایا تھا۔ اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

''بالفعل از طرف سرکار آں چناں قوانین جاری شدنی ست کہ ازاں رسم تعزیہ داری و مراسم ختنہ و پردہ نشینی زنان وغیرہ احکامات شرع و شاستر برافتد و یکسر موقوف گردد حالانکہ این ہم غلط است وافترائے محض۔ سرکار بہادر را در راہ و رسم و کیش و مذہب کداسی کس دست اندازی منظور نیست بلکہ

این معنی برخلاف طریقه رعیت پروری که سجیه مرضیه سرکار بہادر ست بوده است،، ۔

برصغیر پاک و ھند میں اخبارات کا یہ پہلا دور تھا بلکہ یوں کہئے کہ تجرباتی دور تھا ۔ دھلی میں اس زمانے میں تین اخبارات مقبول تھے۔ 'صادق الاخبار، جو سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور مقبول ترین اخبار تھا 'خلاصة الاخبار، اور 'اردو اخبار، 'صادق الاخبار، کا ایڈیٹر ایک مسلمان شخص تھا ۔ جنگ آزادی کے بعد اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور ھندوؤں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لوگوں کو بھڑکانے اور بغاوت پر آمادہ کرنے میں سب سے زیادہ اسی اخبار نے حصہ لیا ھے ۔ جنگ آزادی کے خاتمے پر انگریزوں کی طرف سے بہادر شاہ پر مقدمہ قائم کیا گیا تو 'صادق الاخبار، کے چند مضامین کو سرکاری وکیل نے بطور شہادت استغاثہ فراھم کیا تھا ۔ ان مضامین میں کابل اور ایران وغیرہ کی خبریں ھیں ، اور فاضل ایڈیٹر نے ان پر ایک مدبر، متین، معاملہ فہم اور صاف گو اخبار نویس کی حیثیت سے تبصرہ بھی کیا ھے ۔ ایڈیٹر نے کوئی بات محض لوگوں کو اشتعال دلانے یا ان کو کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے نہیں لکھی ۔ غلط افواھوں کی پر زور تردید کی ھے ۔ ان اقتباسات سے تقریباً ۱۱۰ سال پہلے کی طرز اخبار نویسی بھی معلوم ھوجاتی ھے۔ ایڈیٹر 'صادق الاخبار، بہت دور رس، تجربہ کار اور سیاسی و فوجی مبصر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس بر صغیر میں انگریزوں کے قدم اس قدر مستحکم ھوگئے ھیں کہ وہ معمولی شورشوں اور ھنگاموں سے اکھڑ نہیں سکتے 'صادق الاخبار، کا ایک اقتباس ملاحظہ ھو:

اقتباس از 'صادق الاخبار' دھلی:

(صفحہ ۵۸۲)

ایران : ایرانی اخبارات سے یہ تحقیق ھوا ھے کہ شاہ ایران نے اپنی تمام فوجوں کو مختلف اضلاع سے بلاکر طہران میں تا حکم ثانی ٹھہرنے کا حکم دیا ھے ۔ جس کے لئے کہتے ھیں کہ

وہ جو حکم پائیں گی دل و جان سے بجا لائینگی۔ صحیح خبر دی گئی ہے کہ یہ حکم جو امیر دوست محمد خان کے خلاف ہے دراصل شاہ ایران کی ایک چال ہے۔ اپنے اصلی مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کے لئے۔ ان کا مقصد امیر سے لڑنے کا نہیں ہے، بلکہ انگریزوں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے کا ہے۔ امیر برطانوی طاقت پر بھروسہ کرکے انگریزوں سے مل گئے ہیں اور انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان تمام بے لطفیوں کے موجب ہیں۔ شاہ ایران نے سر دست دوستانہ تعلقات انگریزوں سے ظاہراً منقطع نہیں کئے ہیں نہ انہوں نے امیر دوست محمد خان سے ذاتی دشمنی اختیار کی ہے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ تینوں طاقتوں میں کچھ نہ کچھ خیالات کی تبدیلی ضرور ہوگئی ہے۔

اقتباس از 'صادق الاخبار' دہلی:

(نمبر ۲، جلد ۳- مورخہ ۲۳- مارچ ۱۸۵۷)

بادشاہ ایران کے نام سے اعلان: سابق میں چند مفسدین نے دہلی میں ہنگامہ برپا کرنے کے لئے یہ سمجھ کر کہ شہرت ہوگی جامع مسجد کی پشت پر ایک اعلان شاہ ایران کی طرف منسوب کرکے پبلک کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے چسپاں کردیا تھا۔ اس اعلان کا لب لباب یہ تھا کہ ہندو مسلمان دونوں عیسائیوں کی مدد نہ کریں اور شاہ ایران عنقریب ہندوستان فتح کرلے گا۔ اور لوگوں کو انعام و اکرام دیکر خوش کرے گا۔ جس شخص نے یہ اعلان مشتہر کیا ہے اپنا نام محمد صادق بتایا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس لغو و لایعنی بات سے حکام دہلی بہت خفا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جو شخص اس جعل ساز کاذب کو گرفتار کرادیگا خاطر خواہ انعام پائے گا۔ لیکن خدا معلوم وہ اب ہاتھ بھی آئے گا یا نہیں۔ ہمارے اچھے کرم فرما مسٹر محمد صادق خان جعلساز جنہوں نے یہ اعلان کیا ہے ہمیں یقین ہے کہ اگر گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گئے تو ایک دو تلے کا جوتا، سرکہ میں

تر کیا ہوا ان کی ٹانٹ پر پڑیگا - جس سے ان کے بال نہایت خوشنمائی سے جھڑ جائیں گے - اس وقت یہ حضرات سمجھ جائیں گے کہ شیشے کے گھر میں رہکر دوسروں پر پتھر پھیکنا کیا تماشا دکھاتا ہے اور ان بیوقوفوں کی لیاقت کس طرح ناک کی راہ سے نکل پڑتی ہے،،-

یہ اقتباس دہلی کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول اخبار ''صادق الاخبار،، کا ہے - شاہ ایران کے اسی اعلان کے متعلق دہلی کے دوسرے نامور اخبار،، 'خلاصة الاخبار،، کی رائے و قیاس بھی ملاحظہ فرمائیے:

اقتباس از 'خلاصہ' الاخبار' دہلی:

(نمبر ۸ جلد ۱ - مورخہ ۱۳ - اپریل ۱۸۵۷ع)

ایران - چند روز ہوئے کہ جامع مسجد کی دیوار پر ایک اعلان چسپاں کیا گیا تھا - اس پر ایک تلوار اور ڈھال کی شکل بنی ہوئی تھی - اور یہ اعلان شاہ ایران کے پاس سے آیا ہوا بتاتے تھے - اس کا خلاصہ یہ تھا: ''تمام سچے مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ کمر بستہ ہوکر شاہ ایران کی اعانت کریں اور وفا داری سے اس کی حکومت و اختیار کو ملحوظ رکھیں اور انگریزوں سے جہاد کریں تاکہ انہیں تباہ و برباد کرکے اس کی عنایت کے مورد ہوں اور انعامات و خطابات حاصل کریں جو شاہ ایران فراخ دلی سے عطا کرے گا،،- پھر اعلان میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ شاہ ایران یا جمشید ثانی بہت جلد ہندوستان آئے گا اور اس ملک کو خود مختار بنادے گا اور ایران میں عوام الناس جمع ہوکر حسب ذیل فقرہ بار بار تکرار کرتے ہیں: ''خدایا خاک ایران کو بد بختیوں کی ہواسے بچائیو - جب تک کہ خاک و ہوا باقی رہیں،،-

مجسٹریٹ کی عدالت میں بیشمار گمنام درخواستیں وصول ہوئی ہیں اور ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آج کی تاریخ سے ایک

ماہ بعد کشمیر پر حملہ کیا جائے گا، جس کی فرحت افزائی اور خوبصورتی کا ایک شاعر نے یوں خاکہ کھینچا ہے: ''اگر ایک بلبل بصورت کباب کشمیر میں لایا جائے تو کشمیر کی ہوا سے اس کے بھی بال و پر پیدا ہوجائیں گے۔''

محرر اخبار ان تمام باتوں کو مزخرفات اور حمق پر مبنی سمجھتا ہے کیونکہ اگر ممالک حکومتوں کے ہاتھ سے یوں ہی نکل جایا کریں تو فوجوں کا کیا فائدہ؟''

شاہ ایران کے اعلان تسخیر ہند کو اس زمانے کی سیاسی فضا میں بے حد اہمیت حاصل تھی۔ مورخہ ۱۰۔مئی ۵۷ء کو میرٹھ سے جنگ آزادی کی ابتداء ہوچکی تھی۔ فوجیں دہلی آگئی تھیں۔ تمام شہر میں آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد اور کشمکش جاری تھی۔ چنانچہ ۱۱۔مئی ۵۷ء کے، صادق الاخبار، کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو عین جنگ آزادی میں شائع ہوا تھا:

اقتباس از 'صادق الاخبار' دہلی:

(نمبر ۱۹ جلد نمبر ۳ مورخہ ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء)

شاہ ایران کا اعلان تسخیر ہند

انگریزی اخبار ''پنجابی'' کا ایک ایڈیٹر اپنی نمبر ۱۱ کی اشاعت میں رقم طراز ہے کہ محمرہ پر قبضہ کرتے وقت اس کے نامہ نگار کو شہزادے کے خیمے سے ایک اعلان دستیاب ہوا جس کا خلاصہ نامہ نگار مذکور نے بذریعہ تار برق ایڈیٹر کو روانہ کیا ہے اور جسے اب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اعلان کا خلاصہ یہ ہے:

معلوم کرنا چاہئے کہ انگریزی حکومت نے اپنی فتح مندی کا علم سب سے پہلے ہندوستان میں نصب کیا ہے اور پھر آہستہ آہستہ تمام مقبوضات مشرق کے طاقتور سلاطین کو اپنے قابو میں

لا رهی ہے۔ تھوڑا عرصہ گذرا کہ اس نے افغانستان پر قبضہ کیا
تھا لیکن افغانوں کی مسلسل ھنگامہ آرائیوں سے تنگ آکر اسے
چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے لاھور و پشاور اور دیگر خود مختار
ممالک لے لئے۔ اب وہ براہ افغانستان قلمرو ایران کو بھی زیروزبر کرنا
چاھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت ھمارے ھم مذھب
ھمسایہ افغانوں، سے دوستی کررھی ہے تاکہ یہ اسے گذر جانے
دے اور وہ آکر ایران کو تہ و بالا کر ڈالے اور مذھب حق کے
پیروؤں میں نا اتفاقی ڈالدے۔ مزید برآں یہ سنا گیا ہے کہ ایران
پر فوج کشی کی غرض سے ایک انگریزی فوج براہ خشکی روانہ
ھوگئی ہے اور اس نے ایک بحری قلعہ، جو راہ میں پڑتا ہے، اور وہ
مسلمانوں کا ہے، لے بھی لیا ہے اور وھیں مقیم ہے۔ لیکن گورنمنٹ
اسے پیش دستی نہیں کرنے دیتی، اور جانتی ہے کہ اگر وہ
ایسا کرے گی تو مسلمانوں کے غصے اور تیز دھار کی تلوار سے
کام پڑیگا اور بہت جلد جانکنی کی حالت میں، جیسے مچھلی پانی میں
سے باھر، تڑپتی ھوگی اور دم توڑتی پھرے گی۔ لہذا شاہ
ناصر الدین 'بادشاہ ایران، نہایت وثوق سے یہ اعلان کرتے ھیں:

اعلان: تمام فوجوں کو حدود ایران کے مختلف مقامات پر جمع
ھوکر ان دشمنان دین کی مزاحمت کرنی چاھئے جو مخالفین
اسلام ھیں۔ اقوام عرب کو لازم ہے کہ پیمبر کی تعلیم ''جنھوں
نے تمھیں صدمہ پہنچایا ہے تم بھی انھیں صدمہ پہنچاؤ''،
پر عمل کریں۔ پس واجب ہے کہ بوڑھے، جوان، ادنیٰ، اعلیٰ
عقل مند، کج فہم، کسان اور سپاھی، سب کے سب، بے پس و پیش
اپنے ھم مذھبوں کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ھوں، ھتھیار
باندھ لیں۔ علم اسلامی بلند کریں، اور اپنے ھم قوموں کو بھی
راہ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت پہنچائیں، چنانچہ ان کو جو
حامی دین ھوں گے ان کی جانفشانیوں کا اجر خدا عطا کرے گا
اور ما بدولت بھی خوش ھوں گے۔ . . . .
وغیرہ وغیرہ۔

یہ اشتہار جو شاہزادہ ایران کے خیمہ سے نکلا سیاسی حیثیت سے نہایت اہم تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خان کو بھی ''اسباب بغاوت ہند،، میں ایک عنوان قرار دیکر صفائی کے طور پر کہنا پڑا تھا کہ ''اشتہار میں جو مشہور ہے کہ ایران کے شہزادے کے خیمہ سے نکلا اس کا کوئی لفظ ہندوستان کی سازش پر دلالت نہیں کرتا اسکا مضمون صرف اپنے ملک کے لوگوں کی ترغیب کا ہے۔ ہندوستان کی خرابی کا ذکر اس بنیاد پر ہے کہ ایرانیوں کو زیادہ تر آمادگی لڑائی پر ہو، نہ اس مطلب سے کہ ہندوستان سے سازش ہوچکی ہے،،۔

دھلی کے ایک اور اخبار، ''اردو اخبار،، کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

اقتباس از 'اردو اخبار' دھلی:

(نمبر ۱۵- جلد ۱۹ - ۱۲ - اپریل ۵۷ء)

کابل: 'دھلی گزٹ، کا ایک نامہ نگار کابل سے ۲۹- مارچ کو لکھتا ھے، کہ مختصر فوج جسے امیر دوست محمد خان نے پیش لولاک اور سرخیل قبیلوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا تھا، محمد شاہ خان سے مقابلہ کرنے کے بعد، جس میں ان کے تقریباً ۳۰ آدمی ھلاک اور اتنے ھی زخمی کئے گئے ھیں، جلال آباد واپس ھوگئی ھے۔ کثیر مال غنیمت امیر کے سپاھیوں کے ھاتھ لگا ھے اور خان مذکور اپنی جان بچاکر پہاڑی قلعوں میں جو ملغان میں ھیں، جا چھپا ھے۔ میر داد خان کا بھائی ابھی جلال آباد سے آیا ھے اور نامہ نگارکو اطلاع دی ھے کہ امیر، تات میخ کی طرف بڑھ رھے ھیں، لیکن یہ ابھی نہیں معلوم ھوا کہ وہ جشن نوروز بالا باغ میں منائینگے یا کابل میں۔ برادر میر داد خان نے یہ بھی بیان کیا کہ چند انگریزی اخبارات ھندوستان سے شائع شدہ امیر کے سامنے پڑھے گئے جن میں گورنمنٹ کی بدنظمی پر تنقید کی گئی تھی کہ وہ امیر کو خواہ مخواہ روپیہ دیتی ھے حالانکہ وہ دو طرفہ

تعلقات رکھتے ھیں - امیر نے یہ سنکر کہا کہ جب گورنمنٹ پر کوئی مشکل آن پڑتی ھے تو وہ لوگ لاکھوں پونڈ صرف کردیتے ھیں اور اب جبکہ ایرانی، روسیوں کی تحریک پر افغانستان پر چڑھائی کی تیاریاں کررھے ھیں اور محض گورنمنٹ ھند کو دق کرنے کی نیت سے کر رھے ھیں، تو گورنر جنرل نے عقل مندی اور دور اندیشی سے کام لیکر امیر کے عہد و پیمان پر غور کیا ھے کہ وہ قائم رکھنے کے قابل ھے - نامہ نگار کہتا ھے کہ کابل میں اس کا بہت چرچا ھے کہ سلطان محمد خان ھی کی تحریک و مفسدہ پردازی ھے - جو انعام ساجی پہاڑی علاقہ کے باشندوں کو بھڑکا رھا ھے اور معتبر خبر ملی ھے کہ سلطان جان نے کمانڈر ان چیف افواج ایران متعینہ ھرات سے گرشک پر فوج کشی کرنے کی درخواست کی ھے اور کہا ھے کہ اھل گرشک نے اسے اس شرط پر مدد دینی منظور کی ھے کہ تین سال تک کا خراج معاف کردیا جائے -

یہ اردو اخبار دھلی کی کابل سے متعلق خبر تھی - اب، 'صادق الاخبار، دھلی کی دوران جنگ کی ایک اشاعت کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے :

اقتباس از 'صادق الاخبار' دھلی:

(نمبر ۳۴ جلد ۱۹ - مورخہ ۲۳ - اگست ۱۸۵۷ع)

ایران کی فوجی خبریں : پنجاب و پشاور کی طرف سے آنے والے کچھ لوگ بیان کرتے ھیں کہ ایرانی فوج اٹک پہنچ گئی ھے - گو مجھے فی نفسہ اس پر یقین نہیں ھے - مگر میں نے عوام کی زبانی یہ افواہ سنی ھے اس وجہ سے اس کو شائع کیا اور ممکن بھی ھے کہ ایسا ھو کیونکہ کسی طرح بعیدالفہم نہیں جو لغو یا جھوٹ تصور کرلیا جائے - لیکن یہ ضرور خیال آتا ھے کہ جس طرح یہ افواہ مشہور کی جاتی ھے اس پر یقین و بھروسہ نہیں ھوسکتا -

یہ ۲۳ - اگست ۵۷ع کی خبر تھی، اس کے اگلے روز کی خبر اسی اخبار میں ملاحظہ فرمائیے : ایرانی فوج کا نزدیک پہنچ جانا — ایڈیٹر ٹرائمفینٹ نیوز، رقمطراز ہے کہ اس نے پنجاب اور پشاور کی طرف سے آنے والے مسافروں سے سنا ہے کہ ایرانی فوج نے اٹک تک راستہ صاف کرلیا ہے - مجھے چند وجوہات کی بنا پر یہ خبر قابل یقین نظر آتی ہے :

اول — کوئی شخص کچھ نہیں کہتا تاوقتیکہ اس کی کوئی دلیل نہ رکھتا ہو۔

دوم — ولی صفت، شاہ نعمت اللہ صاحب کی پیش گوئی ہے کہ ہندوستان پر عیسائیوں اور آتش پرستوں کی سو سال تک حکومت رہے گی - پھر جب ان کے قلمرو میں بے انصافی و ظلم ہونے لگے تو ایک عرب کا شہزادہ اٹھے گا اور بصد عز و شان آکر انہیں قتل کرے گا۔

سوم — جب ملتان کی فوجوں نے بغاوت کی تو کہا تھا کہ ہمارے افسروں اور شاہ ایران میں خط و کتابت ہوئی ہے -

چہارم — شاہ ایران نے یہ سن کر کہ برطانوی سلطنت میں میرا ایک پرجوش و سرگرم دوست رہے ، ایک جاسوس روانہ کیا تھا اور وہ جاسوس یہاں آیا تھا کہ شاہ ایران نے ہندوستان آنے کا مصمم قصد کرلیا ہے، پس چاہے وہ جلد آئے یا دیر سے مگر اس کے آنے میں کلام نہیں - واللہ عالم بالصواب.

اس کے بعد 'صادق الاخبار' کی ھی ۱۳ - ستمبر ۵۷ع کی اشاعت کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

اقتباس از 'صادق اللاخبار' دھلی:

(مورخہ ۱۳ - ستمبر ۱۸۵۷ع)

ایران : بعض لوگ پھر کہہ رہے ھیں کہ ایرانی فوج درۂ بولان اور بی بی مری پر آگئی ہے اور امیر دوست محمد خان

نے بخوشی خاطر اپنے حدود سے اسے گزرنے دیا ھے - لیکن بموجب مشہور ھندی کہاوت کے کہ برھمن کھانے کی دعوت پر اس وقت یقین کرتا ھے جب کھانا سامنے آجاتا ھے ، اھل ھند اس پر اسی وقت یقین کرینگے جب کوئی عینی شہادت مل جائے گی - لیکن کئی وجوھات کی بنا پر ھم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خواہ موجودہ خبریں صحیح ھوں یا غلط لیکن ھمیں یقین رکھنا چاھئے کہ ایک نہ ایک روز ایرانی فوجیں ضرور آئینگی خواہ درہ بولان سے ھوکر آئیں یا بمبئی یا سندھ سے - باقی خدا ھی علام الغیوب ھے یعنی غیب کی خبریں سوائے اس کے کسی کو معلوم نہیں ،،

دھلی کے مشہور اخبارات ' صادق الاخبار ، ' خلاصة الاخبار ، اور 'اردو اخبار ، کے یہ چند اقتباسات جنگ آزادی کے متعلق پیش کئے گئے ھیں - ان سے اس زمانہ کی خبروں ، وسائل اور اخبار نویسی کے متعلق بھی کافی معلومات حاصل ھوجاتی ھیں -

—*—

بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ

(ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی)

بہادر شاہ ظفر کے روز نامچے کے نام سے جو کتابیں اس وقت دستیاب ھیں ان میں ۱۸۴۴ع سے ۱۸۴۹ع تک کے درباری واقعات کا ذکر ہے ۔ ان کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ھوتا ہے کہ ھندوستان کی انگریزی حکومت اور بادشاہ کے درمیان آئے دن کچھ نہ کچھ غلط فہمیاں اور رنجشیں پیدا ھوتی رھتی تھیں ۔ یہ باھمی رنجشیں اور کدورتیں آھستہ آھستہ بڑھتی گئیں ۔ یہاں تک کہ جب ۱۲ - مئی ۱۸۵۷ع کو جنگ آزادی کی پہلی چنگاری پھوٹی تو دلوں کی یہی کدورت شعلۂ جوالہ بنکر بھڑک اٹھی ۔ اندریں حالات بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، ۱۸۵۷ع کے ھنگامے کا تاریخی اور سیاسی پس منظر ہے، جس کی روشنی میں ھمیں وہ اسباب نظر آتے ھیں جنھوں نے دودمان مغلیہ کے اس آخری تاجدار کو برطانوی حکومت سے ناراض اور بدگمان کردیا تھا ۔

بہادر شاہ کے اس روزنامچے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے اور اس کا صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عہدنامے کا جائزہ لیا جائے جو انگریزوں نے ستمبر ۱۸۰۳ع میں دھلی فتح کرنے کے بعد شہنشاہ ھند، شاہ عالم ثانی کے ساتھ کیا تھا ۔ شاہ عالم اگرچہ بینائی کھوچکے تھے اور اختیار و اقتدار سے بھی محروم تھے لیکن

ہندوستان کے شہنشاہ کی حیثیت سے وہ اب بھی اس برعظیم کی سیاست کے مرکز ثقل تھے۔ اس لئے انگریز ان کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس معاہدے میں یہ شرائط درج کی گئی تھیں کہ :

(۱) وہ خاص علاقہ جو دھلی کے نواح میں دریائے جمنا کے داھنی طرف واقع ھے شاھی خاندان کی کفالت کے لئے دے دیا جائے گا اور یہ علاقہ دھلی کے ریذیڈنٹ کے ماتحت رہے گا۔ مالیات کا وصول کرنا اور انصاف کا قائم کرنا گورنمنٹ کے قانون کے مطابق شاہ عالم کے نام سے ہوگا بادشاہ کو اختیار ھے کہ ایک دیوانی کا افسر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے افسر کلکٹر کے دفتر میں رکھیں جن کا کام یہ ھوگا کہ جانچ پڑتال کریں اور بذریعۂ رپورٹ بادشاہ کو اس امر کا اطمینان دلاتے رھیں کہ وصولئی مالگزاری میں جو خرچ ھورھا ھے اس کا کوئی حصہ خورد برد نہیں کیا جا رہا ھے۔

(۲) دھلی شہر اور اس اراضی کے باشندوں کے لئے جو بادشاہ کے نام منتقل کردی گئی ھے دیوانی اور فوجداری کی دو عدالتیں قائم ھوں گی جو اسلامی قانون کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرینگی۔ فوجداری عدالتوں کے سزائے موت کے حکم کی تعمیل اس وقت تک نہیں کی جائے گی جب تک بادشاہ سے منظوری نہ لے لی جائے۔

(۳) بادشاہ اور ان کے خاندان کی کفالت کے لئے ایک لاکھ روپے ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔ اس رقم کے علاوہ دس ہزار روپے سالانہ ھندو اور مسلمانوں کے خاص تہواروں کے موقع پر قدیم رواج کے مطابق دئے جائیں گے۔

یوں سمجھنا چاھئے کہ ھندوستان کے طول و عرض میں اگرچہ انگریزوں کی حکومت قائم تھی لیکن دھلی میں شاہ عالم کی سیادت کو از راہ مصلحت باقی رکھا گیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور انگریزوں کے پاؤں مضبوطی سے جمتے گئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ مغل بادشاہ کی بالادستی کو ختم کردینا

چاهئے - جنوب میں مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کی طاقت فنا کی جاچکی تھی - ادھر شمال میں سکھوں کا زور توڑا جاچکا تھا - لے دے کے یہ مغل شاھنشاھیت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی تھا جس کی موجودگی برطانوی اقتدار کی آنکھ میں کانٹا بنکر کھٹک رھی تھی - چنانچہ انگریزوں نے بتدریج ایسی حرکتیں شروع کیں جن سے اس عہد نامے کی خلاف ورزی ھوتی تھی - بہادر شاہ ظفر کے روز نامچے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ھے کہ وہ قابل اعتراض اور خلاف قاعدہ حرکات کیا تھیں -

اول تو شہر دھلی سے دیوانی اور فوجداری کی دونوں عدالتیں جو شرع اسلامی کی رو سے انفصال مقدمات کے لئے قائم کی گئی تھیں منسوخ کردی گئیں اور ان کی جگہ برطانوی قانون کے مطابق انگریزی حکومت نے اپنی عدالتیں قائم کیں اور ان عدالتوں پر بادشاہ کا قطعاً کوئی اختیار نہ تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ پڑھکر حیرت ھوتی ھے کہ بادشاہ اور خاندان شاھی کے دیگر افراد پر آئے دن ان عدالتوں میں لوگ دعوے دائر کرتے رھتے تھے اور یہ سب کچھ انگریز ریزیڈنٹ کے علم سے ھوتا تھا - بادشاہ کو ھر لمحہ اپنی بے بسی کا احساس تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے خلاف جو معناً نہ سہی لیکن لفظاً اب بھی شہنشاہ ھند تھا، معمولی بنئیے اور ساھوکار ان عدالتوں سے ڈگریاں لے لے کر شاھی جائداد قرق کراتے تھے۔ بہادر شاہ بار بار دھلی کے انگریز ریزیڈنٹ کو لکھتا ھے کہ شاھی جائداد قرق نہیں ھوسکتی - لیکن ریزیڈنٹ نہایت ھوشیاری سے بادشاہ کی ان پیہم عرضداشتوں کو نظر انداز کردیتا ھے -

ابتداء میں جب شاہ عالم کے ساتھ انگریزوں کا معاھدہ ھوا تو یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ دھلی شہر پر بادشاہ کی عملداری قائم رھے گی لیکن بہادر شاہ کے زمانے میں وہ عمل داری سراسر ایک مذاق بن کر رہ گئی تھی۔ شروع سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ جب بادشاہ کی سواری قلعۂ معلیٰ سے نکلتی اور راستے میں اتفاق سے کوئی انگریز، بگھی یا گھوڑے پر سوار، ملتا تو وہ

فوراً نیچے اتر کر آداب بجا لاتا تھا۔ بہادر شاہ کے ساتھ انگریزوں نے ادب و نیاز کا یہ سلوک بھی ترک کردیا تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ کے روزنامچے میں اس قسم کا ایک واقعہ درج ہے کہ ایک روز جمنا کے کنارے بادشاہ کی سواری جارہی تھی تو راستے میں ایک انگریز گھوڑے پر سوار ملا۔ جب وہ نہایت بیباکی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا بادشاہ کے برابر سے نکلنے لگا تو شاہی خدام نے اسے زبردستی گھوڑے سے اتار دیا۔ بعد میں دھلی کے انگریز ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے اس واقعہ کی سخت شکایت کی کہ انگریزوں کو اس طرح سر راہ سواری سے اترنے اور آداب بجا لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ اس قسم کے واقعات کو اپنی توہین سمجھکر سخت رنجیدہ ہوتے ہوں گے۔ دھلی کے بازاروں میں بھی پہلے یہ قاعدہ تھا کہ انگریز اگر ھاتھی پر سوار ہوکر نکلتے اور راستے میں شاہی خاندان کے افراد کی سواری ملتی تو انگریز اپنے ھاتھی کو ایک طرف کرلیتے تھے تاکہ خاندان شاہی کی سواری گذر جائے، لیکن بہادر شاہ کے خاندان کے لوگوں سے انگریز حکام نے یہ ترجیحی سلوک بھی ترک کردیا تھا۔

بہادر شاہ کے والد، اکبر شاہ ثانی، کے عہد تک گورنر جنرل نے اپنی سرکاری مہر پر ''وفادار اکبر شاہ،، اور ''حلقہ بگوش اکبر شاہ،، کے الفاظ کندہ کرا رکھے تھے۔ اور گورنر جنرل جب بادشاہ کو کوئی خط لکھتا تھا تو وہ خط حقیقتاً ایک عرضداشت یا درخواست کی شکل میں ھوتا تھا۔ لیکن بہادر شاہ کے زمانے میں گورنر جنرل نے اس مہر کا استعمال ترک کردیا تھا اور بادشاہ کے ساتھ ہر قسم کی مراسلت بھی بند کردی تھی بلکہ یہ حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ براہ راست گورنر جنرل کو کسی قسم کا خط نہیں لکھ سکتا اور اگر اسے گورنر جنرل تک کوئی بات پہنچانی بھی ہو تو وہ دھلی کے انگریز ریزیڈنٹ کے توسل سے پہنچائی جائے۔ بہادر شاہ اس نوع کے توہین آمیز سلوک سے سخت دل گرفتہ تھے اور ان کے روزنامچے میں اکثر مقامات پر اس کوفت اور

دل گرفتگی کے آثار ملتے ہیں۔

ایک اور چیز جو بہادر شاہ کے روزنامچے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ شاہ عالم ثانی کے وقت سے قاعدہ چلا آرہا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام جن میں برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف بھی شامل تھے جشن شاہی کے موقع پر بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کیا کرتے تھے۔ انگریزوں نے آہستہ آہستہ اس رسم کو بھی مٹادیا تھا۔ مدعا اور مقصود یہ تھا کہ شاہ دھلی کے تفوق کا احساس لوگوں کے دلوں سے محو کردیا جائے تاکہ عوام بادشاہ کو کہیں ہندوستان کا مالک تصور نہ کرنے لگیں۔ اس حربے کو زیادہ کارگر بنانے کے لئے دھلی کے انگریز ریزیڈنٹ کو یہ تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان لوگوں پر بھی کڑی نگاہ رکھے جو وقتاً فوقتاً بادشاہ سے تخلئے میں ملاقات کرتے ہیں۔ چنانچہ گنے چنے درباری امرا کے علاوہ اگر کوئی اجنبی بادشاہ سے علیحدگی میں ملتا تو ریزیڈنٹ بادشاہ سے اس ملاقات کی تفصیلات دریافت کرتا تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچے میں اکثر ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں عرب، ایران یا جنوبی ہند کے کسی درویش صفت اور فقیر منش مسافر نے بادشاہ سے ملاقات کی تو دوسرے ہی روز ریزیڈنٹ کی بارگاہ سے جواب طلبی کا پروانہ وارد ہوگیا۔ انگریزی حکومت نہایت ہوشیاری سے، لیکن در اصل اپنی مطلب براری کے لئے، لال قلعہ کو سازشوں کا مرکز بنارہی تھی اور بادشاہ کو ان تمام ہتھکنڈوں کا علم تھا۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ شاہی خاندان میں ہر ممکن طریقے سے تفرقہ پیدا کیا جائے اور پھوٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ وہ ایک شہزادے کو دوسرے کے خلاف، اور بادشاہ کی ایک بیوی کو دوسری بیوی کے خلاف، آمادۂ پیکار کرتے رہتے تھے اور بادشاہ بعضی اوقات ان خانگی جھگڑوں سے اس قدر پریشان ہوجاتے تھے کہ وہ مجبوراً انگریز ریزیڈنٹ کو خط لکھتے تھے کہ خدا را ان شہزادوں کو سمجھاؤ کہ وہ اپنی حرکتوں سے خاندان شاہی کو بدنام نہ کریں۔ بادشاہ کو

معلوم تھا کہ اس فتنہ و فساد کو بالواسطہ ھوا دینے والا وھی انگریز ریزیڈنٹ تھا جس سے وہ استمداد کررہے تھے۔ لیکن حالات نے انھیں اس قدر عاجز اور بے بس کردیا تھا کہ وہ تنگ آکر اسی شخص سے اپنے مرض کا علاج کرانا چاھتے تھے جس نے مرض پیدا کیا تھا۔ بہادر شاہ کے روزنامچے میں اکثر اس قسم کے واقعات کا تذکرہ ھے۔ روز نامچے کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ انگریز گورنر جنرل جب صوبجات مغربی کا دورہ کر رھا تھا تو اس نے دھلی آکر بادشاہ سے ملنے کی خواھش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن شرط یہ عائد کی تھی کہ ملاقات بالکل مساویانہ طریق سے ھوگی۔ یعنی گورنر جنرل اور بہادر شاہ کے درمیان حیثیت اور مرتبے کا کوئی فرق نہیں ھوگا۔ بادشاہ کو یہ شرط منظور نہیں تھی اور وہ گورنر جنرل کو اپنے برابر جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس بنا پر ملاقات نہ ھوسکی۔

اس واقعہ کے بعد انگریزی حکومت نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ بادشاہ دھلی کی مرکزی حیثیت کو بالکل ختم کردیا جائے تاکہ لوگ اچھی طرح ذھن نشین کرلیں کہ اب ھندوستان کی فضا میں سوائے برطانوی جھنڈے کے اور کوئی جھنڈا نہیں لہرا سکتا۔ سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ شاھی خاندان کو لال قلعہ سے نکال کر قطب صاحب میں آباد کیا جائے۔ دھلی کا لال قلعہ شاہ جہاں کے وقت سے مغل شہنشاھیت کا مرکز اور ھندوستان کا قلب تصور کیا جاتا ھے۔ انگریز جانتے تھے کہ خاندان مغلیہ کی جاہ و سطوت کے مٹ جانے کے باوجود ھندوستان کے دور دراز گوشوں کے لوگ ابھی تک لال قلعہ ھی کو حکومت ھند کا اصلی محور سمجھتے تھے۔ عوام کی یہ نفسیاتی کیفیت برطانوی راج کے استقلال کے لئے بیحد نقصان دہ تھی۔ چنانچہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر لال قلعہ پر مغلوں کا جھنڈا بدستور لہراتا رھا تو بہت ممکن ھے کہ آئندہ چل کر یہ پرچم برطانوی شہنشاھیت کے پرچم کا حریف ثابت ھو۔

دوسری چیز جو انگریزوں کے دل میں کانٹا بنکر کھٹک رھی تھی یہ تھی کہ لال قلعہ میں رھنے والے حکمراں کو بادشاہ کے لقب سے محروم کردیا جائے۔ بہادر شاہ اگرچہ بالکل بے دست و پا انسان تھا۔ لیکن وہ ابھی تک عوام ھی کے لئے نہیں ، بلکہ اس برعظیم کے تمام والیان ریاست کے نزدیک بھی اس وسیع و عریض ملک کا جائز وارث اور ھندوستان کا شہنشاہ تھا۔

انگریزوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے جانشین کو 'بادشاہ، کی بجائے صرف 'شہزادے، کے لقب سے پکارا جائے گا اور شاھی خاندان کو لال قلعہ سے نکال کر قطب صاحب بھیج دیا جائے گا۔ بہادر شاہ کو ان تمام باتوں کا بخوبی علم تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسی دوران میں ۱۸۵۷ع کا ھنگامہ برپا ھوا تو شاھی خاندان نے ڈوبتے ھوئے انسان کی طرح اپنی زندگی بچانے کی آخری کوشش کی اور ظاھر ھے کہ اسی کوشش میں فنا ھوگئے۔

—*—

بہادر شاہ ظفر کے فرامین

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اورنگ زیب عالمگیر رح کی وفات ۱۷۰۷ع میں ہوئی اور ۱۷۵۷ع میں پلاسی کی تاریخی جنگ، جس میں انگریزوں کو شمالی ہندوستان میں پہلی فتح نصیب ہوئی در اصل اسی دن قسمت نے سلطنت کا فیصلہ کردیا اور اگلے تقریباً دو سو سال تک ہزاروں میل دور بیٹھے ایک قوم کے چند افراد لاکھوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے رہے۔ ۱۷۰۷ع سے ۱۷۵۷ع تک صرف پچاس سال کی مختصر مدت میں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی مستحکم سلطنت جس طرح پارہ پارہ ہوئی۔ اسکی داستان دلخراش بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ حکومت اور امارت نے خون سفید کردئے تھے مذہب، ایمان، اخلاق سب کی بند شیں ٹوٹ گئی تھیں۔ طوائف الملوکی تھی۔ افراتفری تھی۔ ذہنی اور سماجی انتشار تھا غرض آفات اور حوادث کی ایسی آندھیاں چل رہی تھیں کہ امید کی شمعیں جلائی جاتیں اور بجھ جاتیں۔ سلطان شہید ٹیپو اور سراج الدولہ سے بہادر شاہ ظفر تک انہیں آندھیوں میں امید کے چراغ روشن کرنے والے بھی موجود تھے۔ ان کے ذرائع اور وسائل محدود تھے۔ انہیں بیگانوں ہی سے شکایت نہ تھی، اپنوں کا بھی شکوہ تھا۔ اور آج جب ہم پچھلے دو سو سال کی تاریخ کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ان کی امیدیں اور تمنائیں

ان کے ولولے اور ان کا جوش عمل اور ان کی ناکامیاں اور محرومیاں ایک مرقع بنکر سامنے آجاتی ھیں ۔

بہادر شاہ ظفر پر سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوگیا ۔ لیکن کیا ظفر چاہتے تو وہ اس انقلاب کو روک سکتے تھے ؟ کیا ان میں اس قدر طاقت اور قوت تھی جو وہ اس تناور درخت کو جس کی بنیادیں پوری ایک صدی سے گھلتی چلی آرھی تھیں ، گرنے سے روک لیتے ؟ اور کیا وہ تنہا اس جنگ آزادی میں ، جسے برطانوی عہد کے مؤرخین ''غدر،، کے مکروہ نام سے یاد کرتے ھیں ، ایک سامراجی قوت کا کامیابی سے مقابلہ کرسکتے تھے ؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ھیں ۔ لیکن ان کا جواب بہادر شاہ ظفر کا مؤرخ ھی دے سکتا ھے ۔ ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اس جنگ آزادی کی کہانی ان کے فرامین میں کہاں کہاں اور کس طرح ظاہر ہوتی ھے ۔

بہادر شاہ کے مطبوعہ فرامین میں ان کے وہ احکام شامل ھیں جو جنگ آزادی کے ایام میں انہوں نے بعض درخواستوں اور مراسلوں پر تحریر کئے تھے ۔ اور جن کو بہادر شاہ پر مقدمہ چلاتے وقت بطور شہادت ان کے خلاف پیش کیا گیا تھا ۔ یہ کاغذات Trial of Bahadur Shah میں شامل تھے ۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے ''غدر کے فرمان،، کے نام سے انکا ترجمہ کردیا ۔ یہ خطوط بیشتر اردو میں تھے ۔ Trial of Bahadur Shah میں ان کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ھے اور پھر انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئے ۔ اس طرح ان فرامین کی عبارت اصل بہادر شاہ کی عبارت نہیں ھے اور یہ بھی ممکن ھے کہ ان میں تصرف کیا گیا ہو ۔ بہرحال ان فرامین کے مطالعہ سے کئی باتیں واضح ہوجاتی ھیں ۔ سب سے پہلے یہ کہ بہادر شاہ جنگ آزادی کی تحریک کا مرکز اور محور تھے ۔ لیکن یہ ایک عوامی تحریک تھی اور اختلاف مذہب یا اختلاف زبان ان لوگوں کے اتحاد میں مانع نہ تھا جو اس جنگ میں شریک تھے ۔ دوسری طرف

ان فرامین سے اس جنگ کی ناکامی کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ خزانہ خالی تھا بہادر شاہ کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی جو سپاہیوں کو باقاعدہ اور بر وقت تنخواہ مل جاتی۔ یہی حال سامان حرب اور آلات جنگ کا تھا۔ رسد کا یہ حال تھا کہ جو فوج دھلی میں موجود تھی اس کے ایک حصے کو دو دن کا فاقہ گذر چکا تھا جب سو من بھنے ہوئے چنے طلب کئے گئے۔ پھر اس کے ساتھ آپس کی چشمک، حسد، رقابت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی جاری تھی۔ یعنی خود اپنی صفوں میں اتحاد نہ تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو ذاتی مفاد کے لئے انگریزوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور انہیں میں وہ جاسوس شامل تھے جو ہر کارروائی کی اطلاع دشمن کو پہنچاتے رہتے تھے۔ ایسے ایک بزرگ محمد درویش تھے جنہوں نے لفٹنٹ گورنر کو ایک خط میں لکھا تھا کہ بادشاہ دھلی حسن عسکری کی معرفت شاہ ایران سے ساز باز کررہے ھیں۔ اور بادشاہ کے کمرۂ خاص میں شب و روز ایرانیوں کی فوری آمد کا ذکر رھتا ہے۔ بغرض خیر خواھی مندرجہ بالا حالات سے مطلع کیا گیا ہے، اب گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ مناسب بندوبست کرے۔ اس خیر خواہ کی یہ خیر خواھی ۲۴ - مارچ ۱۸۵۷ع کو لفٹنٹ گورنر کو ملتی ہے۔ جنگ آزادی مئی میں شروع ھوئی۔ گویا مہینوں پہلے جو تیاریاں ھو رھی تھیں ان کی تفصیل سے انگریز پوری طرح آگاہ تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہادر شاہ کمرۂ خاص میں جن مشاھیر و اکابر سے گفتگو کرتے تھے اور جو خفیہ احکام صادر فرماتے تھے۔ ان کی اطلاع بھی لفٹنٹ گورنر کو ھوجاتی تھی۔ ۱۸ اگست ۱۸۵۷ع کو لکھا ھوا ایک خط ملتا ہے جو مکند لال نے لکھا ہے۔ مکند لال کے خط میں ۲۷ خطوط و ھدایات کی تفصیل ہے اور لکھنے والا مکند لال بہادر شاہ کا سکریٹری ہے۔ مکند لال ھندو تھا اگر اس جنگ کی نوعیت صرف یہ ھوتی کہ مسلمان اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے تو ظاھر ہے

غیر مسلموں پر بھروسہ نہ کیا جاتا اور کم از کم انہیں بادشاہ کے سکریٹری کا اہم عہدہ ہرگز نہ دیا جاتا۔ بادشاہ کا دل صاف تھا لیکن جن لوگوں پر اعتماد کیا گیا وہ اس اعتماد کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ بہادر شاہ کی بیکسی اور بے بسی کا اندازہ ان کے اس فرمان سے کیجئے:

''بنام فرزند ما بدولت شہرۂ آفاق دلاور مرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل بہادر ــ جانو کہ جب پیدل و سوار میرے پاس آئے تھے تو میں نے خود اپنی زبان سے ان سے کہدیا تھا کہ میرے پاس خزانہ یا مال نہیں ھے جس سے میں ان کی مدد کروں۔ انہوں نے میرا یہ بیان سنکر سر تسلیم خم کیا اور میرے لئے اپنی جانوں کو قربان کردینے پر آمادگی ظاہر کی اور ماتحتی اور فرمان برداری کو منظور کیا۔ اس پر انہیں اول ہدایت کی گئی تھی کہ میگزین اور خزانے کی اشیا مہیا کریں تاکہ اس سے انہیں اور مجھے فائدہ پہنچے دوسرے یہ کہ اگرچہ اس معاملے میں ان سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا تاہم روپیہ قرض لیا گیا۔ تاکہ ہر پیدل و سوار کو روزانہ الاؤنس دیا جاوے۔ مکرر فرمان جاری کئے گئے کہ شہر میں لوٹ مار اور داروگیر نہ کی جائے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ فوجی اور سپاہی ایسی زیادتیاں کرتے ہیں کہ ان تمام شہروں میں جو بغیر فوجی دخل کے تصرف میں لائے گئے ہوں ایسی غارت گری نہ ہوئی ہوگی۔ چنگیز خاں اور نادر شاہ بادشاہوں نے بھی ایسے شہروں کو پناہ دی ھے جو بے لڑے بھڑے قبضے میں آگئے ہوں''۔

اس کے بعد بہادر شاہ سپاہیوں کی بدتمیزی کی شکایت کرتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے اعلی افسر بھی قلعہ دیکھنے آتے تو دیوان عام کے دروازے پر گھوڑوں سے اتر پڑتے۔ اور وہاں سے پیدل آتے۔ لیکن یہ لوگ دیوان خاص کے کمرے تک گھوڑوں پر بیٹھے چلے آتے ہیں۔ ابتری اور افراتفری کی طویل اور دلخراش داستان بہادر شاہ ان الفاظ میں ختم کرتے ہیں:

''اس حکومت کی بربادی صاف عیاں ہے۔ مجبوراً تھک کر ہم نے آخرکار اپنی بقیہ عمر یاد الٰہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی ہے اور خطاب شہنشاہی کو جو تفکرات اور مشکلات سے لبریز ہے موجودہ خطرات و بیقراریوں سے تنگ آکر تہیہ کرلیا ہے کہ ترک کردیں۔ اور کفن پہن کر پہلے خواجہ صاحب کی درگاہ میں جاکر مقیم ہوں اور پھر ضروری انتظام کرکے وہاں سے مکہ مکرمہ روانہ ہوجائیں،،۔

اس ہنگامے میں یہ ضروری تھا کہ شہری زندگی میں کوئی بڑا خلل واقع نہ ہو اور فوج شہری نظم و نسق سنبھالنے کی جگہ مورچوں کا رخ کرے۔ اس ضرورت کے احساس سے ۲۳۔ جولائی کو بہادر شاہ نے یہ فرمان جاری کیا:

''اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی کسی پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ ظلم نہ کرے اور یہ کہ اصل زمینداروں کی رعایا بن کر رہے کہ وہ سلطنت کے خیر خواہ سمجھے جاتے ہیں۔ نظم و نسق کے لئے بہت جلد فوجی قوت روانہ کی جائے گی۔ اعلی حضرت بادشاہ سلامت کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبودی کی فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ وہ تمام لوگ جو بد امنی پھیلانے یا حکام با اختیار سے سرکشی کرنے کے مجرم ہوں گے مستوجب سزائے شدید ہوں گے۔ یہ اعلان عوام کی آگاہی کے لئے کیا جاتا ہے،،۔

کسی جنگ میں سب سے اہم کام فوجی نقل و حرکت اور محاذ جنگ کی ترتیب ہے۔ یہ کام سوائے فوجی ماہروں کے کسی اور کے بس کا نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یا تو فوج میں قحط الرجال تھا کہ اس کام کے قابل کوئی آدمی نہ تھا یا آپس کے حسد و رقابت کی وجہ سے بادشاہ کو خود ان امور کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً کمانڈر انچیف مرزا مغل تھے جو بادشاہ کے فرزند تھے۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں ایک عرضی پیش کرتے ہیں:

''چونکہ اعلیٰ حضرت نے فوج کو میرٹھ جانے کا حکم صادر فرمایا ہے لہذا رسد وغیرہ کے انتظامات کے لئے بیس سوار، پچاس

پیدل پہلے سے جانے ضروری ھیں - امید ھے کہ خادم کو ان کے روانہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی،، -

اس پر بہادر شاہ نے پینسل سے یہ فرمان لکھا ھے :

''میر حیدر حسین خان ۲۰ سواروں کو اور شاھرخ بیگ پچاس پیدلوں کو روانہ کردیں،، -

بادشاہ اس موقع پر صرف نقل و حرکت ھی کی نگرانی نہیں کرتے تھے بلکہ رسد اور سامان حرب کے حمل و نقل کی ذمہ داری بھی ان پر تھی - چنانچہ ۲۰ جون کو کمانڈر مرزا مغل کے نام ایک فرمان میں لکھا گیا -

''معلوم ھو کہ شورہ لانے کے لئے چھ گاڑیاں تیار کی گئی ھیں - جو باھر جمع ھیں اور بارود کے لئے جس کی ضرورت ھے - پس 'باقاعدہ پیدل، کے پچیس آدمیوں کو اس کی حفاظت کے لئے مقرر کردو کہ بہ حفاظت میگزین پہنچ جائے - نیز فوجی پہرہ متعینہ لاھوری دروازے کے نام احکام جاری کرو کہ اس آمد و رفت میں رخنہ اندازی نہ کریں،، -

اگر بہادر شاہ کا کام صرف فوجوں اور فوجی سامان کے نقل و حمل تک محدود ھوتا تو ایک بات تھی ، فوجوں کی بھرتی اور ملازمت کی ذمہ داری بھی بالآخر براہ راست ان پر ڈال دی گئی تھی - اور ھر ملازم ھونے والے کی درخواست ان کے سامنے پیش ھوتی تھی - مرزا مغل کے نام ایک فرمان میں لکھتے ھیں

''معلوم ھو کہ بے شمار آدمیوں کی درخواستیں تمہاری درخواست کے ساتھ موصول ھوئیں جن میں نوکری کی خواھش کی گئی ھے فرزند تم کو معلوم ھے کہ خزانہ شاھی میں روپے کی قلت ھے - ''قسمتوں،، سے متوقع آمدنی وصول نہ ھونے اور فوج کے باھر جاکر بندوبست نہ کرنے اور حکومت میں ڈاکہ زنی و لوٹ مار کرنے کے سبب سے اور پھر ھر حصہ ملک سے کثیر افواج کے ایک جگہ جمع ھوجانے کے سبب اخراجات روزمرہ بھی پورے نہیں ھوتے - پھر ان لوگوں کو کیونکر

ملازم رکھا جائے؟ اور ان کی تنخواہیں اور اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں ؟ ایسی حالت میں ان لوگوں کو جن کے وطن دور دراز فاصلے پر ہیں موہوم امیدیں دلانی بالکل بے جا بات ہے ،،۔

برہمن ، حجام ، دھوبی ، درزی تک کے تقرر کا مسئلہ بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا جاتا۔

بہادر شاہ کی ذمہ داریوں کا تو یہ حال تھا اور ان کی کس مپرسی کا یہ عالم کہ نہ ان کے پاس روپیہ تھا، نہ فوج اور نہ سپاہ ان کے احکام کی تعمیل کرتی تھی۔ وہ تنہا اس جنگ کو کیسے جیت سکتے تھے؟ سب سے بڑی پریشانی روپے کی کمی سے پیدا ہوئی۔ ایک فرمان سے اس کا اندازہ کیجئے:

''فرزند شہرۂ آفاق دلاور، مرزا ظہور الدین عرف مرزا مغل کمانڈر انچیف بہادر، معلوم ہو کہ فوج کی روزانہ یا ماہانہ تنخواہ دینے اور میگزین کے ضروری مصارف اور اخراجات توپ خانہ و بارود کے لئے خزانے میں روپیہ بالکل نہیں ہے اور بارود نہ ہوئی تو دشمن سے لڑنا دشوار ہوجائے گا۔ لہذا ضرورت ہے کہ فی الفور کہیں نہ کہیں سے بغیر سود کے قرضہ لیا جائے۔ اور پنجابی سوداگروں اور انگریزوں کے مالدار نوکروں سے بھی روپیہ لیکر خزانہ میں داخل کیا جائے۔ نیز یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ہنڈیاں بنا کر ہمارے پاس بھیجو کہ ہماری مہر خاص اس پر ثبت کی جائے اور روپیہ وصول کرنے کے لئے انہیں تقسیم کیا جائے۔ جس میں معاہدہ ہوگا کہ مال گذاری کی آمدنی وصول ہونے پر سب کا روپیہ ادا کردیا جایگا۔ قرض مذکور میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا جائے گا۔ اور اس پر تمام لوگوں کو یقین دلادو۔ ما سوا اس کے اگر وہ لوگ چندے کا بندوبست کریں گےتو علاوہ ان کا قرضہ ادا کرنے کے اپنے اپنے مراتبے اور لیاقت کے موافق ملازمت اور انعام بھی دیا جائے گا۔

ان حالات میں بہادر شاہ کے نیک ارادے ، ان کی ذاتی

مستعدی اور سرگرمی کیا کام آسکتی تھی۔ ان فرامین کے مطالعہ سے یقین ھوجاتا ھے کہ بہادر شاہ کے بس میں جو کچھ تھا انہوں نے اس سے گریز نہ کیا لیکن یہ جنگ شروع ایسے وقت ھوئی جب ملک اس کے لئے پوری طرح تیار نہ تھا۔ اور اس فیصلے کی ذمہ داری بھی بہادر شاہ ظفر پر نہیں۔ وہ اس جنگ میں شریک ھوئے اور شرکت کی پوری ذمہ داریاں قبول کیں۔

آخر میں بہادر شاہ ظفر کی ایک نظم کے چند اشعار سنئے جو مجموعہ ''فغان دھلی،، میں شامل ھیں ۱۸۵۷ع کا ھنگامہ ایسا نہ تھا جس کا اثر صرف بہادر شاہ ظفر کی ذات یا اس کے متوسلین تک محدود رھا۔ دلی جو اس سے پہلے بھی کئی بار لٹ چکی تھی اس مرتبہ ایسی اجڑی کہ پھر اس کی خرابی شرمندۂ تعمیر نہ ھوسکی۔ دلی کے مٹنے سے مراد صرف وہ عمارات نہیں جو آج کھنڈر بن چکی ھیں۔ دلی ایک تہذیب، ایک معاشرت، ایک روایت کی علمبردار تھی۔ یہ تہذیب یہ معاشرت اور یہ روایت اب محض ایک افسانہ رہ گئی ھے۔ لیکن اس چمن کے بعض عنادل اس وقت بھی نالہ سرا ھوئے تھے اور آج بھی نوحہ خواں ھیں۔ مجموعہ ''فغان دھلی،، میں انہیں نالوں کو جمع کیا گیا ھے۔ اور سب سے پہلا نالہ بہادر شاہ ظفر کا ھے:

کیا پوچھتے ھو کجروی چرخ چنبری
ھے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ھے خوار تو نہیں جن کو ھے برتری
اس کے مزاج میں ھے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ھے گوشت زاغ فقط استخواں ھما
کیا منصفی ھے زاغ کہاں اور کہاں ھما
بالعکس ھیں زمانے میں جتنے ھیں کاروبار
شیوہ کیا ھے الٹا زمانے نے اختیار
ھے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجب روش باغ روزگار

جو نخل پر ثمر ہیں اٹھاسکتے سر نہیں
سر کش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں
باد صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دم بدم کف افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل مغیلاں نہال ہوں
جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہوویگا سرپہ چرخ بھی جاوینگے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زندان یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جبتک ہے تن میں جاں
جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

اور اس جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں بہادر شاہ ظفر رنگون میں جلا وطنی کی زندگی گزار کر قید حیات اور قید فرنگ دونوں سے چھوٹ گئے۔

انگریز افسروں کے خطوط

خاندان مغلیه کی حکومت کے آخری دور میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی محض مالگزاری وصول کرنے کی ٹھیکه دار تھی۔ لیکن انگریزوں نے انگلی پکڑتے ھی پہنچا پکڑ لیا اور ھر قسم کا تسلط شروع کردیا۔ بادشاہ صرف پنشن خوار رہ گیا۔ لال قلعه پر بھی پہرہ چوکی انگریزوں کا رہتا تھا۔ اور ھر قسم کا ملکی انتظام بھی انہوں نے اپنے ھاتھ میں لے لیا تھا۔ ۱۱۔ مئی ۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی کے سپاھیوں نے اپنے انگریزی افسروں کی حکم عدولی کی اور کچھ سامان اسلحه لیکر دھلی کی طرف کوچ کردیا۔ بات یه ھوئی که انگریزوں نے بہت سے ایسے کام کئے تھے جن کی وجه سے بادشاہ کی رعایا ان سے ناراض ھوگئی تھی۔ اول تو لارڈ ڈلہوزی نے، جو کمپنی کی طرف سے گورنر جنرل تھا، بہت سی ھندوستانی ریاستوں کو ضبط کرلیا تھا۔ چنانچه مسلمانوں کی بڑی ریاست، اودھ، اور مرھٹوں کی ریاست، ستارا، اسی گورنر جنرل نے ضبط کی تھی اور لوگوں کا عام طور پر خیال ھوگیا تھا که بس اب کوئی ریاست ضبطی سے نه بچیگی۔ اس زمانے میں عیسائی پادریوں نے اپنے اپنے مذھب کا پرچار شروع کردیا تھا۔ اور بہت سے مشنری مدارس شروع سے لیکر بی۔ اے تک جاری کردئے گئے تھے اور وھاں انجیل مقدس کا پڑھنا لازمی قرار دیدیا گیا تھا۔ ان باتوں سے عوام کو یه خیال پیدا ھوگیا که یه عیسائی مذھب پھیلانے کی کوششیں ھیں۔ اور عام مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔

پھر کمپنی کی حکومت بھی جابر اور سخت تھی۔ فوج کے سپاھیوں پر جو فوری اثر پڑا وہ چربی کے نئے کارتوس کا تھا۔ انہیں منہ سے کھولکر بندوق کی نال میں لگایا جاتا تھا ان کارتوسوں کے بارے میں ہرجگہ سپاھیوں کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ ان مین ہمارا دین دھرم بگاڑنے کے لئے سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔

یکم اپریل ۱۸۵۷ع کو ایک اشتہار اس مضمون کا جامع مسجد دھلی میں چسپاں کیا گیا تھا کہ ۱۱ مئی کو دھلی لوٹی جائے گی۔ اور بڑا کشت و خون ہوگا۔ چنانچہ میرٹھ کے سپاھیوں کا ایک گروہ صبح کے وقت ۷ بجے کشتیوں سے دریا کو پار کرکے شہر میں داخل ہوگیا۔ ان میں کچھ نیزے سوار تھے اور گیارہ ہندوستانی رجمنٹ کے پیدل اور بیس سوار تھے یہ لوگ ''سائمن فریزر'' ریزیڈنٹ کی کوٹھی میں گھس گئے۔ جو انگوری باغ میں قلعہ کے نیچے تھی۔ فریزر صاحب پر سپاھیوں نے حملہ کیا تو وہ براہ ثمن برج، قلعہ کے اندر چلے گئے اور دروازہ بند کرلیا۔ وھاں سے قلعہ کے لاھوری دروازہ پر گئے اور دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد میرٹھ کے سپاھی آئے اور صوبہ دار سے دروازہ کھلوا کر قلعہ کے اندر داخل ہوگئے کپتان ڈگلس اور فریزر صاحب نے مقابلہ کرنا چاھا لیکن قلعہ کی گارد نے ان کا حکم نہ مانا اور یہ قلعہ کی اندرونی طرف بھاگے۔ راستے میں سپاھی مل گئے اور انہوں نے دونوں کو مار ڈالا۔ بہت سے سپاھی دریا گنج کی طرف چلے گئے۔ جہاں زیادہ تر انگریزوں کے مکانات تھے وھاں انہوں نے آگ لگادی۔ اس عرصے میں ایک اور انقلابی رجمنٹ آئی۔ پانچ انگریزوں اور دو میموں کو شہر کے مفسدوں نے مار ڈالا۔ لیکن جس قدر عیسائی تھے وہ سب راجہ کشن گڑھ کی کوٹھی میں جاکر پناہ گیر ہوگئے اور وہ محفوظ رہے۔ جب دریا گنج جل کر خاک ہوگیا تو وھاں سے یہ رجمنٹ بنک کی کوٹھی گئی اور ان ہی سپاھیوں میں سے پانچ سوار چھاؤنی پہنچے اور وھاں کے سپاھیوں کو اپنے زمرہ میں شامل کرکے فرنگی افسروں کے بنگلوں

کو جلانا شروع کردیا ۔ کچھ سوار اور سپاھی میگزین کی طرف بڑھے ۔ مگر وہ سب سپاھی اور تقریباً ایک ہزار شہری میگزین کے پھٹنے سے اڑ گئے ۔ یہ میگزین خود انگریزوں نے اڑایا تھا ۔ لفٹنٹ ریز ۔ ڈیولی ۔ شابکلی ۔ کرڈ اور دیگر فوجی افسران وھاں موجود تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ میگزین ان کے قبضہ سے نکل جائے گا تو انہوں نے اسکو اڑادیا ۔ اسکے بعد انقلابیوں کا قبضہ شہر دھلی پر مکمل ھوگیا ۔ اور انقلابیوں کے دوسو سوار گوڑ گانواں کی طرف گئے اور سرکاری خزانہ، جس میں ۷ لاکھ چوراسی ہزار روپیہ تھا ، لوٹ کر دھلی واپس آگئے اور اب دھلی اور گوڑ گانواں کے خزانہ کا کل روپیہ ملکر اکیس لاکھ چوراسی ہزار روپیہ ھوگیا جو قلعہ شاھی اور انقلابی سپاھیوں کی حراست میں رکھا گیا اس وقت دھلی میں تین رجمنٹیں ایک میرٹھ کی اور دو خاص دھلی کی موجود تھیں ان کے علاوہ دو سو سوار اور بھی تھے ۔ باقی انقلابیوں کی فوج علی گڑھ اور آگرہ کی طرف روانہ ھوگئی ۔ لیکن انقلابی تقریباً بیس، بائیس روز تک کرنال وغیرہ کی طرف نہ گئے اور نہ دھلی کی طرف انگریزوں کی کمک آنے کو روکا ۔

معلوم ھوتا ھے کہ جنرل سر ھنری برناڈ نے جو اس وقت کمانڈر انچیف تھا ۔ صرف دو ہزار فوج سے دھلی کا محاصرہ کرنا شروع کردیا تھا ۔ اورانقلابیوں کے پاس کم ازکم سات ہزار فوج اس وقت موجودتھی، چنانچہ ایک مراسلہ جنرل سر ھنری برنارڈ کمانڈر انچیف نے جارج کارنک برنس کے نام، جو دریائے ستلج کی مغربی ریاستوں کے کمشنر تھے، ۲۴ ۔ جون ۵۷ء کو بھیجا تھا ۔ اس میں لکھتے ھیں کہ : ''ھر گھڑی مجھکو امید ھوتی ھے کہ ھماری توپیں قلعہ کی دیواروں کی توپوں کو خاموش کرسکتی اور مجھے اس قابل بناسکتی ھیں کہ کامیابی کی معقول امید کے ساتھ قریب پہنچکر اس مقام پر قبضہ کرلوں لیکن ان کی توپوں کی زیادتی میری ھمت پست کئے دیتی ھے ۔ بس اب (جیسا کہ واقعہ ھے) میرے سامنے ھے اور مجھے کسی چیز کا خوف نہیں ۔ سوائے اس کے اور کوئی تدبیر

نہیں کہ میں ایک اچانک اور زبردست حملہ کردوں۔ لیکن ان چاندنی راتوں میں یہ کام آسان نہیں معلوم ہوتا .... میں صرف چھ توپوں کا انتظام کرسکا ہوں۔ اور ان کے چلانے والے بھی بالکل ناتجربہ کار ہیں۔ یہ (باغی) حیوان تقریباً ہر روز باہر نکلتے ہیں اور دو دفعہ تو میں نے انہیں خاصی کمی کے ساتھ واپس بھیجا لیکن میرے سپاہی بھی ضائع جاتے ہیں .... واقعہ یہ ہے کہ آٹھویں تاریخ سے لیکر اب تک اوپر تلے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں ۲۴ پونڈ وزنی گولہ پھینکنے والی توپیں باغیوں کے برجوں میں ہر جگہ نصب ہیں اور ان کے پیچھے تقریباً سات ہزار سپاہی بھی موجود ہیں (ایسی حالت میں) داخلہ آسانی کے ساتھ نہیں ہوسکتا،،۔

دوسرے خط مورخہ ۱۷۔جون ۵۷ء میں لکھتے ہیں کہ ''جو دیواریں (فصیلیں) کہ میدانی توپوں کے ذریعہ منہدم کی جانے والی تھیں وہ ۱۸ پونڈ وزنی گولوں کے مقابلہ میں جوں کی توں نہایت مضبوطی سے قائم ہیں،،۔

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انقلابیوں نے انگریزوں کی فوج پر چھوٹے حملے تو کئے لیکن کوئی زبردست حملہ نہ کیا۔ حالانکہ ان کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور توپیں بھی زیادہ بھاری گولہ چلاسکتی تھیں۔ شاید تجربہ کار افسروں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسا حملہ نہ کرسکے۔ ورنہ پہلی ہی جنگ آزادی میں ہم انگریزوں سے آزاد ہوجاتے۔ کہا جاتا ہے کہ انقلابیوں کی عدم کامیابی سے متنفر ہوکر ایک بوڑھی خاتون، سبز پوش، گھوڑے پر سوار اور تلوار و بندوق سے مسلح ہوکر خود میدان جنگ میں اتر آئی تھی جسکو لفٹننٹ ہڈسن نے اپنی چٹھی میں جون آف آرک سے تشبیہ دی ہے۔ تیسرے مراسلے مورخہ ۱۸۔جون میں وہ لکھتے ہیں کہ ''مجھے قدرے اطمینان ہوا اس لئے کہ آپ نے اس تجویز کو نا پسند کیا کہ میں اپنی مختصر سی فوج کو لے کر دھلی میں داخل ہونے کا خطرناک تجربہ کروں۔ جو فوج کہ

دو ہزار سپاہیوں سے بھی کم ہو اور جو دہلی جیسے طول و عرض کے شہر میں پھیلی ہوئی ہو، وہ کوئی فوجی طاقت نہیں رہ سکتی تھی۔ ضرب لگانے کے لئے مناسب موقع کا احتیاط کے ساتھ مجھے انتظار ہے۔ حالت یہ ہے کہ دہلی توپوں سے پٹی پڑی ہے۔ اور وہاں وہ سپاہی مقیم ہیں جو اگرچہ کھلے میدان میں چنداں اہمیت نہیں رکھتے تاہم پتھر کی فصیلوں کے پیچھے رہ کر کچھ نہ کچھ کار گزاری بالضرور دکھا سکتے ہیں۔ اور جنہیں بھاری توپوں کے استعمال سے بھی کچھ واقفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہفتے کے دن گولہ باری کی صحت و درستی نے ہمیں نیچا دکھایا۔ پس انبالہ والی فوج اور چھ توپیں رکھنے والی دو پلٹنیں اس پر کبھی اپنا قبضہ نہیں جماسکتیں ......"

"ذرا ایک مرتبہ ہم شہر میں پہنچ جائیں پھر تو بازی ہماری ہے بشرطیکہ ہم اس پر قبضہ رکھ سکیں۔ تاخیر سخت تکلیف دہ ہے اور روزانہ ان حملوں میں سپاہیوں کا ضائع جانا نہایت دل شکن معلوم ہوتا ہے۔

باوجود اس کے کہ یہ انقلابی، بادشاہ یا بادشاہ کے ولی عہد کے حکم کی پروا نہ کرتے تھے، انہوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ یا تو دو مہینے کی تنخواہ دو یا ہمارا روزینہ مقرر کردو۔ اس پر بادشاہ نے عام لوٹ مار بچانے کے لئے شہر کے مہاجنوں سے کہا کہ اگر وہ سپاہ کی درخواست پوری نہ کریں گے تو سب اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مہاجنوں نے کہا کہ ہم ان کو صرف بیس روز تک دال روٹی کھلاسکتے ہیں۔ لیکن انقلابی اس پر راضی نہ ہوئے۔ اس وقت بادشاہ نے یہ سن کر پیدل کے چار آنے یومیہ اور سوار کا ایک روپیہ مقرر کردیا۔

اب انقلابیوں نے شہر کی ناکہ بندی شروع کردی جس کی وجہ سے شہر میں سامان خورد و نوش بھی آنا بند ہوگیا۔ اور باشندگان شہر ناقابل اطمینان حالت میں دن گزارنے لگے۔ ہر روز ایک نیا کوتوال مقرر ہوتا تھا۔ اور انقلابی جہاں نقد روپیہ دیکھتے

فوراً لوٹ لیتے۔ یہ سب روپیہ سپاہیوں کے قبضہ میں رهتا اور خزانہ شاهی میں ایک حبہ داخل نہ هوتا۔ بعض رجمنٹوں کے پاس اس قدر روپیہ جمع هوگیا تھا کہ وہ بمشکل حرکت کرسکتی تھیں۔

بادشاہ کا حکم شاذ و نادر هی مانا جاتا تھا۔ اور شہزادوں کو تو کوئی پوچھتا هی نہ تھا۔ سپاہ بالکل بے سری هوگئی تھی۔ نہ بگل کو مانتے تھے نہ افسروں کی سنتے تھے اور نہ اپنا متعلقہ کام انجام دیتے تھے۔ فوج کی گنتی تو ایک طرف رهی، کبھی وردی بھی نہیں پہنی۔ ظاهر هے کہ ایسی حالت میں کیا کامیابی کی امید هوسکتی تھی۔ اگرچہ فوجی سامان کی کمی نہ تھی اور لڑنے والے بھی بہت تھے لیکن کمی صرف نظم و ترتیب کی تھی اور یہی حال کانپور اور لکھنو وغیرہ کا بھی تھا۔ اگر سب یہ مطالبہ کرتے کہ کمپنی کی بجائے بادشاہ کی حکومت رهے گی اور کمپنی کی ٹھیکہ داری موقوف هوگی تو لوگوں اور خود انگریزوں کو یقین هوجاتا کہ یہ ضرور هوکر رهے گا۔ پھر سب اس جنگ آزادی میں شریک هوجاتے اور انگریزوں کی مدد نہ کرتے۔

ایک مراسلہ سرجان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے جارج کارنک بارنس کو ۱۱۔ اکتوبر ۵۷ع کو بھیجا تھا جس میں لکھا تھا۔ طوفان ختم هوگیا اور همیں سانس لینے کی فرصت ملی۔ یقیناً یہ بات هماری توقعات سے زیادہ نکلی کہ تمام پنجابی پلٹنیں وفادار رهیں۔ پٹیالہ، نابھہ اور جیند کے لئے جو انعامات همیں تجویز کرنے چاهئیں۔ ان پر ذرا اپنے ذهن میں غور و خوض کرلیجئے۔ انہیں ضرور انعام و اکرام چاهئے۔ اگر وہ وفاداری نہ کرتے تو هم کہاں کے رهتے؟

—*—

غالب کے مکاتیب

(مولانا غلام رسول مہر)

سرزمین پاک و ہند میں انگریزوں کی حکمرانی کا سنگ بنیاد پلاسی کے میدان میں رکھا گیا۔ بعد ازاں قریباً نوے برس میں یہ اجنبی حکومت پورے ملک پر مسلط ہوگئی اور مزید سو برس تک عنان فرمانروائی اسی کے ہاتھ میں رہی۔ اس عہد کا ایک نہایت اہم واقعہ ۱۸۵۷ع کا وہ ہنگامۂ خونیں تھا جسے اہل وطن ابتدا ہی سے ''جنگ آزادی،، قرار دیتے رہے۔ لیکن خود انگریزوں نے اسے ''غدر،، کا نام دیا۔ یہی نام مدت تک تاریخ کی درسی کتابوں میں استعمال ہوتا رہا۔

مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اردو تصانیف نظم و نثر میں اس واقعے پر جو کچھ لکھا اگر اسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم جلد تیار ہوجائے۔ فارسی نثر کی ایک کتاب جس کا نام ''دستنبو،، ہے صرف اسی واقعہ سے متعلق ہے۔ لیکن میں آج جو نقشہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ محض مرزا کے مکاتیب سے جستہ جستہ اقتباسات لے کر تیار کیا ہے۔

تمہید کے طور پر عرض کردینا چاہئے کہ اس ہنگامے کا آغاز ۱۱-مئی ۱۸۵۷ع کو پیر کے دن ہوا تھا۔ چار مہینے اور چار دن انگریز شہر سے بے دخل رہے۔ ۱۴-ستمبر ۱۸۵۷ع

کو وہ دوبارہ دھلی میں داخل ہوئے۔ ۱۸۔ستمبر کو شہر مکمل طور پر ان کے قبضے میں آگیا۔ مرزا اس پوری مدت میں ایک دن کے لئے بھی باھر نہ نکلے۔ ان کا مکان بلی ماراں میں تھا جہاں شریف خانی حکیموں کے مکانات تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد سرکار پٹیالہ میں ملازم تھے۔ جب انگریزی فوج دوبارہ دھلی میں داخل ہوئی تو اھل شہر گھر بار چھوڑ کر دھلی دروازے ترکمان دروازے اور اجمیری دروازے سے باھر نکل گئے۔ بلی ماراں کے دروازے پر والئی پٹیالہ نے شریف خانی خاندان کی حفاظت کے لئے اپنا پہرہ بٹھادیا تھا۔ اس طرح مرزا کی حفاظت کا بھی بندوبست ہوگیا۔ اور انہیں گھر بار چھوڑ کر باھر نہ نکلنا پڑا۔

مرزا کے مکاتیب میں اس واقعے کے متعلق سب سے پہلی تحریر نومبر ۱۸۵۷ع کی ھے جب کہ انگریز شہر پر قابض ہوچکے تھے۔ حکیم غلام نجف کو لکھتے ھیں :

''میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمے میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ھے،،

پھر ۹۔جنوری ۱۸۵۸ع کو تحریر فرماتے ھیں :

''جو دم ھے غنیمت ھے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔ قلم ھاتھ میں لئے بہت کچھ لکھنے کو جی چاھتا ھے۔ مگر لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ھے تو کہہ لینگے ورنہ انا اللہ و انا الیہ راجعون،،.

یہ اگرچہ چند فقرے ھیں جن میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ لیکن لفظ لفظ بتارھا ھے کہ اس وقت حالات کتنے نازک تھے اور بے یقینی کس پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔

یہ ھنگامہ در حقیقت ایک خوفناک زلزلہ تھا جس نے

سب کچھ تہہ و بالا کر ڈالا ۔ جس ماحول میں مرزا نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس گزارے تھے اسکی بساط لپیٹی جاچکی تھی۔ اور اس کی جگہ بالکل نیا ماحول پیدا ھوگیا تھا ۔ مرزا کے دل پر اس وسیع اور ھمہ گیر انقلاب کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ ۱۸۵۷ع کے پیشتر کے دور اور بعد کے دور کو دو الگ الگ عالم سمجھنے لگے تھے ۔ یا کہنا چاھئے کہ ھندوؤں کے طریق تعبیر کے مطابق ان کے نزدیک ایک جنم ختم ھوگیا تھا ، اور دوسرا جنم وجود میں آگیا تھا۔ اپنے عزیز ھندو شاگرد ھرگوپال تفتہ کو تحریر فرماتے ھیں :

''صاحب ۔ تم جانتے ھو کہ یہ کیا معاملہ ھے اور کیا واقعہ ھوا ۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ھم تم باھم دوست تھے ۔ اور طرح طرح کے ھم میں تم میں معاملات سہر و محبت در پیش آئے ۔ شعر کہے ۔ دیوان لکھے اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ھمارے تمہارے دلی دوست تھے ۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور ''حقیر،، ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رھا نہ وہ اشخاص ۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط ۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ھم کو ملا ۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ھے ۔ یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا ۔ اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ھرگوپال و متخلص بہ تفتہ ھو ، آیا اور میں جس شہر میں رھتا ھوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماراں کا محلہ ۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا،، ۔

میں عرض کرچکا ھوں کہ انگریزی فوج کے داخلے کے ساتھ ھی اھل شہر باھر نکل گئے تھے ۔ اور پورا شہر بے چراغ ھوچکا تھا ۔ انگریزوں نے اس کے بعد عام داروگیر کا سلسلہ شروع کردیا ۔ مرزا فرماتے ھیں : ''مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے ۔ جاگیردار پنشن دار ، دولت مند ، اھل حرفہ کوئی بھی نہیں ۔ مفصل لکھتے ھوئے ڈر لگتا ھے ۔ ملازمان

قلعه پر شدت ہے۔ باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں،،۔
پھر فرماتے ہیں :

''اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات۔ ہے رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یعنی (مارشل لا) یازدھم مئی سے آج تک یعنی پنجشنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھکو نہیں معلوم،،۔

مرزا کے ایک شاگرد، منشی شیونارائین ''آرام،، نے آگرے سے ایک اخبار نکالا تھا۔ مرزا سے استدعا کی کہ اس کے لئے خریدار بہم پہنچائیے۔ جواب میں فرماتے ہیں :

''یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوگئے تو جنس پوری دے دیں گے۔ کاغذ (یعنی اخبار) روپیہ مہینے کا کیوں مول لیں گے،،

میر مہدی مجروح نے اسی زمانے میں ایک غزل بھیجی اس کے مقطع کا آخری مصرع یہ تھا :

''میاں یہ اہل دھلی کی زباں ہے،،

اس مصرع نے مرزا کے ساز درد کا ہر تار ہلا دیا۔ فرماتے ہیں :

''اے میر مہدی۔ تجھے شرم نہیں آتی ''میاں یہ اہل دھلی کی زباں ہے،،۔

''اے، اب اہل دھلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے .... اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر،،

نواب علاؤالدین خان کو لکھتے ہیں :

"میری جان۔ یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے . . . . .
ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی
سراسر ہنود"۔

جنگ آزادی میں اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں
حصہ لیا تھا لیکن انگریزوں کی نظروں میں اصل مجرم صرف مسلمان
تھے۔ چنانچہ وہی زیادہ تر داروگیر کے ہدف بنے۔ انہیں کو بالعموم
پھانسیاں ملیں۔ انہیں کی جائدادیں ضبط ہوئیں شہر سے باہر
نکلنے میں بھی ہندو اور مسلمان برابر تھے۔ لیکن ہندوؤں کو
بہت جلد گھروں میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ مسلمان
بدستور باہر پڑے رہے۔ یا جن کو کسی دوسرے شہر میں
ٹھکانا نظر آیا، وہاں چلے گئے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔
کیا امیر، کیا غریب کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے
ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں"۔

"ابھی دیکھا چاہئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے
یا نہیں"۔

مدت تک مسلمانوں کو شہر میں آباد ہونے کا حکم نہ ملا۔
تو ان میں سے بعض نے شہر کے باہر ہی جگہ جگہ عارضی مکان
بنانے شروع کردئے۔ اس پر حکم ہوا کہ سب مکان ڈھادئے جائیں
اور اعلان کردیا جائے کہ آئندہ کوئی مکان نہ بنائے۔ مرزا
لکھتے ہیں:

"کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان
وکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں گروا دو۔
آئندہ کو ممانعت کا حکم سنادو۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے
شہر کے بسنے کی کونسی مہورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی خارج
کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔
الملک للہ و الحکم للہ"۔

جنگ آزادی سے کم و بیش دو برس بعد حکم ہوا کہ مالکان مکان اپنے مکانوں میں آجائیں ۔ لیکن کرایہ دار باہر ہی پڑے رہیں ۔ اوائل نومبر ۱۸۵۹ء میں حکم ہوا کہ کرایہ دار بھی آجائیں ۔ لیکن کرایہ مالکان مکان کو نہیں بلکہ سرکار کو ادا کریں ۔ مرزا ۹ ۔ نومبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں :

''آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں ۔ کرایہ دار نہ رہیں ۔ پرسوں سے حکم ہوگیا کہ کرایہ دار بھی رہیں ۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کریں ۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہتے تھے ، وہ بھی آرہیں مگر کرایہ سرکار کو ادا کریں''۔ ابتدا میں کوئی شخص اجازت کے بغیر شہر میں نہیں آسکتا تھا جو چھپ چھپا کر آجاتا اور پکڑا جاتا اس کے پانچ بید لگتے یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ۔ اور آٹھ دن قید میں رہتا ۔ پھر ٹکٹ چھاپے گئے ۔ اور اعلان ہوگیا کہ جو مسلمان شہر میں آباد ہونا چاہے وہ ٹکٹ خریدیں اور اپنی حیثیت کے مطابق جرمانہ داخل* کرے ۔ چنانچہ ٹکٹ پر یہ عبارت درج کردی گئی تھی ۔ ''ٹکٹ آبادی درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ''۔ جرمانے یا نذرانے کی رقم حاکم کی رائے پر موقوف تھی ۔ جتنی رقم وہ مقرر کردیتا ادا کرنی پڑتی تھی''۔

مرزا کے نہایت عزیز دوستوں میں سے مولانا فضل حق خیر آبادی پر مقدمہ چلا ۔ کالے پانی بھیجے گئے ۔ اور وہیں ۱۹ ۔ اگست ۱۸۶۱ء کو فوت ہوئے ۔ مفتی صدرالدین ''آزردہ'' کی ساری جائداد ضبط ہوگئی ۔ خاصی تگ و دو کے بعد انہیں کچھ جائداد ملی ۔ جس سے ماہانہ چالیس روپے کرایہ وصول ہوتا تھا ۔ اسی میں گزارا کرتے رہے، نواب مصطفیٰ خان پر مقدمہ بنا ۔ سات برس قید کی سزا پائی اور جائداد ضبط ہوگئی ۔ اپیل میں وہ بری ہوئے ۔ مظفر الدولہ، سیف الدین حیدر خاں، حسین مرزا مدت تک لکھنو اور کلکتے کی جانب سرگرداں پھرتے رہے ۔ ان کا

گھر بار تباہ ہوگیا۔ جائیداد ضبط ہوگئی۔ نواب حامد علی خاں گرفتار ہوئے ان پر مقدمہ چلا۔ جائیداد ضبط ہوگئی۔ محل سرا اور کوٹھی پر گوروں نے قبضہ کرلیا۔ دکانیں ڈھادی گئیں۔ اور ان کا ملبہ فروخت کرکے روپیہ داخل خزانۂ سرکار ہوا۔ حامد علی خاں بیچارے نے داروگیر سے پائی رہائی توکرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ تباہی کی عام حالت مرزا کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں :

امراء اسلام میں سے حسن علی خاں بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامراد بن گیا۔ میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیر زادہ اور نانا کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی خدا بخش ہوچکا ہے، بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا (نواب ضیاء الدین احمد خاں کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احباب کو پوچھو۔ ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہوجائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ نوش جان کرکے بہ یک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کے پاس پانچ سو روپے کی املاک واگذشت ہوکر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ و برباد لاہور گیا ہے۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہو۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں،،۔

ایک اور خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہوجاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہے تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے۔ غم مرگ۔ غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ میں

قلعہء نا مبارک سے قطع نظر کرکے اهل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا، انیس بیس برس کا بچہ، مصطفٰے خان ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خان اور مرتضیٰ خان، قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا ؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ۔ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق: حسین مرزا یوسف مرزا میر سرفراز حسین میرن صاحب۔ خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ ان اموات کے غم اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ ہوتا ہے۔ یہاں اغنیا و امرا کے اولاد و ازدواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں،،۔

مرزا کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ کوئی واقعہ پیش آجاتا تو ان کے دل میں جنگ آزادی کے بعد کا دور مصائب تازہ ہوجاتا۔ ان کے شاگرد مرزا تفتہ نے اپنی کتاب ''سنبلستان،، چھپوائی۔ اس کی لکھائی چھپائی اچھی نہ تھی۔ مرزا نے اس واقعے کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بد حالیوں پر آنسو بہانے کا بہانہ بنالیا۔ فرماتے ہیں:

''اجی مرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اس کاپی کی مثال جب تم پہ کھلتی کہ تم یہاں ہوتے۔ اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے پائینچے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں،،۔ اس وقت کے انگریزوں کی دماغی حالت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہوسکیگا کہ انہوں نے جامع مسجد کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اور اس کے دروازوں پر ایک سکھ بٹالین کا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ اسے گرجا بنالیا

جائے۔ جنگ آزادی سے قریباً پانچ برس بعد مسجد وا گزار ہوئی۔

مرزا نے ایک عجیب عبرت افزا واقعہ لکھا ہے۔ جن مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط ہوئی تھیں ان میں ایک حافظ محمد بخش تھے جن کا عرف ''ممون،، تھا۔ بعد میں وہ بے قصور ثابت ہوئے اور جائیداد کی بحالی کا حکم مل گیا۔ انہوں نے کچھری میں درخواست دی کہ میری جائیداد پر قبضہ دلایا جائے۔ انگریز حاکم نے نام پوچھا۔ عرض کیا محمد بخش۔ چونکہ درخواست میں عرف بھی درج تھا اس لئے حاکم نے پوچھا ''ممون،، کون ہے؟ عرض کیا کہ نام میرا محمد بخش ہے۔ لوگ مجھے ''ممون، ممون،، کہہ کر پکارتے ہیں۔ صاحب نے سن کر فرمایا:

''یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممون بھی تم۔ سارا جہان بھی تم جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممون اپنے گھر چلے آئے،،۔

آخر میں جنگ آزادی کے متعلق مرزا کا ایک قطعہ لکھتا ہوں جو انہوں نے اپنے ایک دوست کو خط ہی میں لکھا تھا۔ یہ ان کے مکاتیب میں چھپ گیا اور دیوان میں شامل نہ ہوسکا:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلح شور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

شہر دھلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یا رب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

—*—

(ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ)

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی